افسانہ اور ناسٹلجیا: اکیسویں صدی کے منتخب افسانوں کا کرداری مطالعہ

مقالہ برائے ایم فل (اُردو)

مقالہ نگار:

مہوش منصور

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری، ۲۰۲۲ء

افسانہ اور ناسٹلجیا: اکیسویں صدی کے منتخب افسانوں کا کرداری مطالعہ

مقالہ نگار:

مہوش منصور

یہ مقالہ

ایم فل (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان وادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری ، ۲۰۲۲ء

©مہوش منصور

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: افسانہ اور ناسٹلجیا: اکیسویں صدی کے منتخب افسانوں کا کرداری مطالعہ

پیش کار: مہوش منصور رجسٹریشن نمبر: 1727/M/U/S19

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اردو زبان وادب

ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان ____________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

پروفیسر ڈاکٹر عامر اعجاز ____________________

پرو ریکٹر اکیڈمکس

تاریخ: ____________

اقرار نامہ

میں، مہوش منصور حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم فل اُردو اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

مہوش منصور

مقالہ نگار

فہرست ابواب

مقالہ اور دفاع کی منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
فہرست ابواب	iv
Abstract	vii
اظہارِ تشکر	viii
باب اول: موضوعِ تحقیق کا تعارف و بنیادی مباحث	۰۱
ا۔ تمہید	۰۱
i. موضوع کا تعارف	۰۱
ii. بیان مسئلہ	۰۱
iii. مقاصدِ تحقیق	۰۲
iv. تحقیقی سوالات	۰۲
v. نظری دائرہ کار	۰۲
vi. تحقیقی طریقہ کار	۰۳
vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۰۳
viii. تحدید	۰۴
xi. پس منظری مطالعہ	۰۴
x. تحقیق کی اہمیت	۰۴
ب۔ ناسٹلجیا کا تعارف	۰۴
ج۔ ناسٹلجیا کی قسمیں	۰۸
i. وطن واپس جانے کی خواہش	۰۹
ii. ناسٹلجیا ایک نفسیاتی بیماری	۱۰
iii. ماضی کو دہرانے کی خواہش (Restorative)	۱۲

د۔	ناسٹلجیا کے محرکات و عوامل	۱۳
i.	ہجرت اور فسادات	۱۳
ii.	عصری صورتحال	۱۷
iii.	نائن الیون اور بدلتی عالمی صورتحال	۱۹
iv.	انسانی رشتوں میں دوری	۲۳
v.	معاشرتی و تہذیبی ورثے سے دوری	۲۴
vi.	بے یقینی، لاتعلقی اور خوف کا احساس	۲۶
vii.	تشخص کی تلاش	۲۷
	حوالہ جات	۳۰
باب دوم۔	انتظار حسین کے افسانوں میں ناسٹلجیائی رجحان کا مطالعہ	۳۳
الف۔	یادِ ماضی اور ہجرت کے تناظر میں	۳۳
ب۔	سماجی ناسٹلجیا اور نفسیاتی ناسٹلجیا کے تناظر میں	۴۱
	حوالہ جات	۴۸
باب سوم۔	محمد حمید شاہد کے افسانوں میں ناسٹلجیائی رجحان کا مطالعہ	۴۹
الف۔	یادِ ماضی اور ہجرت کے تناظر میں	۴۹
ب۔	سماجی ناسٹلجیا اور نفسیاتی ناسٹلجیا کے تناظر میں	۶۱
	حوالہ جات	۶۷

باب چہارم۔	محمد عاصم بٹ کے افسانوں میں ناسٹلجیائی رجحان کا مطالعہ	۶۹
الف۔	یادِ ماضی اور ہجرت کے تناظر میں	۶۹
ب۔	سماجی ناسٹلجیا اور نفسیاتی ناسٹلجیا کے تناظر میں	۷۶
	حوالہ جات	۸۳
باب پنجم۔	مجموعی جائزہ	۸۴
	مجموعی جائزہ	۸۴
	تحقیقی نتائج	۸۸
	سفارشات	۸۹
	کتابیات	۹۰

Abstract

The subject of my dissertation is the role of fiction and nostalgia in the study of selected fictions of the 21st century. Urdu fiction flourished under the influence of many trends and movements from the very beginning. Due to the migration that took place as a result of the formation of Pakistan , the individual became a victim of nostalgia .While the internet and electronic advances in the 21st century have shattered the boundaries of social distances, the past process of destroying relationships has also left one person isolated. This known loneliness also cause nostalgia which causes one to take refuge in the memories of the past. Nostalgia is basically a psychological phenomenon that is interrupted as a recollection of the past. The word nostalgia was first used in the 17th century by Jonas Hoffer, a Swiss physician to describe homecoming or the desire to return home. It is now considered and metaphor for happy events and memories of the past. Every writer Expresses nostalgia in one way or another in his writings. Intezar Hussain migrated from India and settled in Pakistan but here often started to miss his hometown due to feeling of alienation so nostalgia can be seen in his writings.Similarly, in the myths of Mohammad Hameed Shahid and Mohammad Asim Butt, the contemporary man seems to be suffering from nostalgia.The fiction of these three writers is a perfect reflection of the elements of nostalgia.

اظہارِ تشکر

اس مقالے کی تکمیل کے لئے میں خدائے بزرگ و برتر کی بے حد شکر گزار ہوں جس نے اپنی عنایتوں کے طفیل مجھے اس تحقیق کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق دی۔ تحقیق میں مشکل ترین مرحلہ موضوع کا انتخاب ہوتا ہے اس سلسلے میں اپنی نگران مقالہ ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر کی ممنون ہوں کہ انہوں نے اس سلسلے میں میری ہر ممکن رہنمائی کی۔ نہ صرف موضوع کے انتخاب میں انہوں نے میری رہنمائی کی بلکہ تحقیق کے ہر مرحلے پر انہوں نے میری حوصلہ افزائی بھی کی۔ ان کے ساتھ میں، ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ڈاکٹر عابد حسین سیال ڈاکٹر نعیم مظہر اور ڈاکٹر صائمہ نذیر کی بھی ممنون ہوں، ان سب کے تعاون کی بدولت ہی میں نے تحقیقی کام کو احسن طریقے سے سر انجام دیا۔

اس مقالے کی تکمیل میں میرے والدین کا کردار قابل ستائش ہے۔ میرے والد محترم نے مجھے کتب خانوں تک پہنچنے کے لیے سفری سہولیات فراہم کیں تو کبھی میرے لیے متعلقہ کتب کی فراہمی کو یقینی بنایا۔ میں اپنی والدہ صاحبہ کے تعاون کی بھی ممنون ہوں جنہوں نے ہر لمحہ میری رہنمائی کی۔ میرے والدین کی دعاؤں اور حوصلہ افزائی کے طفیل ہی میرا تحقیقی کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنے بہن بھائیوں کی بھی ممنون ہوں کہ جنہوں نے اپنی قیمتی آرا اور مشوروں سے مجھے تحقیقی کام کے لیے رہنمائی فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ جلدی کام مکمل کرنے کی طرف رغبت دلائی۔ میں اپنی بہن ایمان کی خصوصاً شکر گزار ہوں جنہوں نے اس مقالے کی ٹائپنگ کے حوالے سے بھرپور تعاون کیا۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنی دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جن کی حوصلہ افزائی اور مشوروں کے سبب دورانِ تحقیق مجھے حوصلہ ملتا رہا۔

مہوش منصور

باب اول

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید

موضوع کا تعارف

انسانی زندگی ماضی، حال اور مستقبل ان تین زمانوں میں منقسم دکھائی دیتی ہے۔ زندگی کا ہر گزرتا لمحہ ماضی میں بدل کر انسانی شعور کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے۔ اگر ماضی، حال اور مستقبل کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ الگ الگ اکائیاں نہیں ہیں بلکہ ایک غیر منقسم کل کا حصہ نظر آتے ہیں۔ ہر فرد کسی نہ کسی طور پر اپنے ماضی میں جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے ماضی سے فرار کسی طور بھی ممکن نہیں۔ میرے مقالے کا موضوع "افسانہ اور ناسٹلجیا: اکیسویں صدی کے منتخب افسانوں کا کرداری مطالعہ" ہے۔ اردو افسانہ ابتدا ہی سے بہت سے رجحانات اور تحریکات کے زیر اثر پروان چڑھا۔ قیام پاکستان کے نتیجے میں ہونے والی ہجرت سے فرد ناسٹلجیا کا شکار ہو گیا۔ تیز رفتار برقی ترقی کی بدولت دنیا گلوبل ولیج میں تبدیل ہو گئی۔ اس ترقی نے جہاں سماجی فاصلوں کی حدبندیوں کو پاش پاش کر دیا وہاں رشتوں کے انہدام اور پامالی کے عمل نے ایک فرد کو تنہائی کا شکار بھی کر دیا۔ یہ تنہائی بھی ناسٹلجیا کا سبب بنتی ہے جس سے فرد اپنے ماضی کی یادوں میں پناہ لینا شروع کر دیتا ہے۔ ماضی کی ان یادوں کا اظہار ہر دور کے ادیب اپنے فن پاروں میں کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ یادداشت نہ ہو تو ماضی بھی نہیں رہتا، یادیں اور ماضی نہ ہوں تو شخصیت کی بنیاد اور جڑیں بھی اہمیت کی حامل نہیں رہتی۔ اس لیے یاد ماضی فرد کی زندگی میں بہت اہمیت کی حامل ہیں کچھ لوگ اپنے حال کی تلخی کی وجہ سے ماضی کے خوشگوار لمحات میں پناہ لینا شروع کر دیتے ہیں۔ مجوزہ موضوع میں اردو افسانوں میں کرداری ناسٹلجیا کے مطالعہ کے ذریعے ان عوامل کی نشاندہی کی جائے گی جو عوامل ایک ادیب کو حال سے کٹ کر ماضی میں پناہ لینے کی طرف راغب کرتے ہیں۔

بیان مسئلہ

اردوافسانہ بدلتے حالات وواقعات کے زیر اثر فروغ پاتا رہا۔ ہر دور کا لکھاری اپنے عہد کی عکاسی اپنے فن پاروں میں کرتا ہے۔ مجوزہ موضوع افسانہ اور ناسٹلجیا: اکیسویں صدی کے منتخب افسانوں کا کرداری مطالعہ کے ذریعے موجودہ صدی میں ہونے والا انسانی رشتوں کا انہدام، معاشرتی و تہذیبی ورثے سے دوری

نے فرد کو انفرادی طور پر کس طرح بے یقینی اور لاتعلقی میں مبتلا کیا ہے۔ ان عوامل اور محرکات کا مطالعہ کیا جائے گا۔

مقاصد تحقیق

مجوزہ تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل ہیں:

1۔ اردو افسانے کے بدلتے تناظر میں ناسٹلجیائی رجحان کا مطالعہ کرنا۔

2۔ انتظار حسین، محمد حمید شاہد اور محمد عاصم بٹ کے افسانوں میں ناسٹلجیائی رجحان کی نوعیت کو سمجھنا۔

تحقیقی سوالات

مجوزہ تحقیق کے دوران مندرجہ ذیل سوالات کو سامنے رکھا جائے گا:

1۔ اردوافسانے کے بدلتے تناظر میں ناسٹلجیائی رجحان کے پیشکش کی نوعیت کیا ہے؟

2۔ انتظار حسین، محمد حمید شاہداور محمد عاصم بٹ کے افسانوں میں ناسٹلجیا کی پیشکش میں کون کون سے عوامل و محرکات کار فرما ہوئے؟

نظری دائرہ کار

ناسٹلجیا بنیادی طور پر نفسیاتی رجحان ہے جسے ماضی کی یاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایک سوئس ماہر طب جونس ہافر (Johansess Hofer) نے سترہویں صدی میں لفظ ناسٹلجیا پہلی مرتبہ گھر کی یاد یا وطن واپسی کی خواہش کے طور پر متعارف کروایا تھا۔ ابتدا میں ناسٹلجیا کو ایک بیماری سمجھا جاتا تھا لیکن اب ایسا نہیں ہے اب اسے ماضی کے واقعات اور خوشگوار یادوں کا استعارہ سمجھا جاتا ہے۔ ماضی کی یادیں کوئی گم شدہ شے نہیں ہیں بلکہ حال و مستقبل کے روشن امکانات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں اس طرح یہ تینوں زمانے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اردو ادب میں ناسٹلجیا آزادی کے بعد ہجرت کی صورت میں پروان چڑھا اور اردو ادب کی ہر صنف میں ناسٹلجیا کا اظہار کسی نہ کسی طور پر نظر آتے ہیں۔ ہجرت کے واقعے نے ایک طرف تو حال و مستقبل کا پتہ دیا تو دوسری طرف ماضی کو کھوجنے، اپنے احساسات کا حصہ بنانے اور سمجھنے کی خواہش بھی

دی۔ ہر لکھاری اپنی تحریروں میں کسی نہ کسی طور پر ماضی کا اظہار کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے کیونکہ آدمی حال میں سانس لیتا ہے لیکن اس کی جڑیں ماضی میں پھلتی پھولتی دکھائی دیتی ہیں۔ مجوزہ موضوع میں اکیسویں صدی کے منتخب افسانوں کا کرداری مطالعہ کرنا ہے۔ ناسٹلجیا کے بارے میں احمد سہیل "اردو افسانے کا ناسٹلجیا" میں لکھتے ہیں:"ناسٹلجیا کا مفہوم غالبا خانہ اداسی لیا جاتا ہے جو یکسر غلط ہے۔ خانہ اداسی سے مراد Homesickness ہے نہ کہ ناسٹلجیا۔ جو بظاہر لاطینی لفظ معلوم ہوتا ہے حقیقتا دو یونانی الفاظ Nostos بمعنی "واپسی" اور Algos بمعنی "درد آلود واپسی" ہو گا۔ اس اعتبار سے لفظ ناسٹلجیا کو ہم "پس کربیہ" بھی کہہ سکتے ہیں لیکن یہ کرب ماضی کی جانب واپسی سے مشروط منسوب ہے۔" اردوافسانے کا ناسٹلجیا" اور قاضی جاوید کا مضمون "ناسٹلجیا کے بارے میں چند باتیں" کو مد نظر رکھتے ہوئے تحقیقی کام کو آگے بڑھایا جائے گا

تحقیقی طریقہ کار

مجوزہ موضوع پر تحقیق کے لیے تاریخی اور دستاویزی طریقہ کار اختیار کیا جائے گا۔ دستاویزی اور بنیادی ماخذات کے ساتھ ساتھ ثانوی مآخذات سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔ انٹرویوز، کانفرنس، سیمینار، تحقیقی رسائل وجرائد کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی کتب کا مطالعہ بھی شامل تحقیق ہو گا۔ موثرادبی جریدوں میں شائع ہونے والے تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی شامل کیے جائیں گے۔ مزید کتب تک رسائی کے لیے سرکاری، جامعاتی اور نجی کتب خانوں سے استفادہ کیا جائے گا۔

مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

مجوزہ موضوع کے حوالے سے ماقبل تحقیق کا جائزہ لیا جائے تو ایک مقالہ "جدید اردو نظم کا بدلتا منظر نامہ: یوٹوپیا سے ناسٹلجیا تک" نمل یونیورسٹی سے اور ناول نگاری کے حوالے سے ایک مقالہ "اردو ناول میں ناسٹلجیا: قیام پاکستان کے بعد علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے کیا گیا ان مقالوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں ناسٹلجیا کے حوالے سے سرسری کام کیا گیا ہے جبکہ افسانہ اور ناسٹلجیا: اکیسویں صدی کے منتخب افسانوں کا کرداری مطالعہ کے حوالے سے کسی قسم کا تحقیقی کام نہیں ہوا۔ مجوزہ موضوع اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد موضوع ہے اور زیر نظر موضوع کے ذریعے اردو افسانوں میں کرداری ناسٹلجیا پر مفصل کام کیا جائے گا۔

تحدید

مجوزہ موضوع پر تحقیق کے لیے منتخب افسانہ نگاروں کے افسانوں کو ہی شامل تحقیق کیا جائے گا۔ان مصنفین کی دیگر تصانیف کو تحقیق کا حصہ نہیں بنایا جائے گا۔ منتخب افسانوں کو سامنے رکھتے ہوئے تحقیقی کام کیا جائے گا۔

پس منظری مطالعہ

زیر نظر موضوع کی تحقیق کے لیے پس منظری مطالعہ کے طور پر افسانوں اور ناسٹلجیا پر مبنی ادب پاروں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ناسٹلجیا کے حوالے سےہاورڈ یونیورسٹی کی پروفیسر سویٹلانا بوئم کی کتاب "دافیوچر آف ناسٹلجیا" کا مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔افسانے کے حوالے سے ڈاکٹر انوار احمد کی کتاب "اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ "ڈاکٹر شفیق انجم کی کتاب "اردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں" اور ڈاکٹر فوزیہ اسلم کی کتاب "اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات" کا مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔

تحقیق کی اہمیت

شاعری اور ناول میں ناسٹلجیا کے حوالے سے ہونے والے کام کو دیکھا جائے تو افسانوں میں ناسٹلجیا کے حوالے سے کام بہت کم ہے۔افسانے پر ناسٹلجیا کے حوالے سے جو کام ہوا بھی ہے تو وہ الگ الگ افسانہ نگاروں پر کیا گیا ہے۔اس لیے مجوزہ موضوع اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد موضوع ہے جو تحقیق کے میدان میں اہمیت کا حامل ہو گا۔

ب: بنیادی مباحث

i. ناسٹلجیا کا تعارف

انسانی زندگی پر نظر ڈالیں تو یہ ہمیں تین زمانوں ماضی، حال اور مستقبل میں بٹی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کے اس سفر کا آغاز انسانی زندگی کے ساتھ ہی شروع ہوا اور ابد تک جاری وساری رہے

گا۔ زندگی کا ہر بیتا لمحہ ماضی کا حصہ بنتا جاتا ہے۔ ایک فرد حال میں زندہ رہتا ہے لیکن وہ اپنے ماضی کو مد نظر رکھ کر اپنے حال کی تشکیل کرتا رہتا ہے کیونکہ ایک فرد حال کے حالات و واقعات سے وقتی طور پر فرار حاصل کرنے کے لیے ماضی کے واقعات اور گزرے دنوں کی صورتحال میں پناہ لیتا رہتا ہے۔ گزرے ہوئے واقعات کی یاد کا عمل ایک فطری عمل ہے اور ہر شخص انفرادی طور پر اپنی یادداشت کی بنا پر اپنے ماضی کی کتاب کھولتا رہتا ہے۔ ان تینوں زمانوں کی عکاسی ادب کرتا ہے۔ ادب سماج کا عکاس اور ترجمان ہوتا ہے جو معاشرتی وسیاسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں وہ ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ اسی طرح قیام پاکستان کے نتیجے میں ہونے والی معاشرتی تبدیلیوں نے جہاں فرد کو حال و مستقبل کا پتہ دیا وہاں اسے ماضی کو تلاش کرنے اور سمجھنے کی راہ بھی متعین کروائی۔ ہجرت کے نتیجے نے ادب کو ایک نئے رجحان ناسٹلجیا سے متعارف کروایا۔ یہ رجحان ان ادیبوں کے ہاں زیادہ غالب نظر آتا ہے جو ہجرت کر کے یہاں آئے کیونکہ کسی شخص میں اپنی زمین سے دوری کا احساس اور اس کی طرف لوٹنے کی خواہش اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کا ماضی اس کے حال کی نسبت زیادہ دلچسپ اور شاندار ہو۔

ناسٹلجیا کے بارے میں بات کریں تو یہ بنیادی طور پر نفسیات سے تعلق رکھتا ہے۔ ناسٹلجیا علم نفسیات کی اصطلاح ہے۔ ماضی کو حال میں دریافت کرنے کو ناسٹلجیا کہا جاتا ہے۔ ناسٹلجیا سے مراد ماضی کی یاد میں کھوئے رہنا ہے۔ سب سے پہلے لفظ ناسٹلجیا ایک سوئس ماہر طب جونس ہافر نے سترہویں صدی میں اس وقت استعمال کیا جب گھر سے اور اپنے وطن سے دوری کی بنا پر سپاہیوں کو بیماری نے اپنے شکنجے میں لے لیا تھا۔ وہ سپاہی اپنے گھر کی یاد اور وطن واپس جانے کی شدید خواہش میں مبتلا تھے۔ ناسٹلجیا کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کے لغوی اور اصطلاحی معنوں پر روشنی ڈالیں۔ آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری کے مطابق ناسٹلجیا کے معنی ہیں:

> "ماضی کی حسرت ناک یادیں، ماضی کی یاد دلانے والی شے یا اشیا، گھر کی یاد، گھر سے دوری کا شدید احساس"[1]

اسی طرح ایڈوانس پریکٹیکل ڈکشنری کے مطابق ناسٹلجیا کے معنی ہیں:

"Nostalgia:n , homesickness

وطن یا گھر سے دور، وطن یا گھر کی یاد، یاد وطن کا عارضہ، وطن واپس جانے کی خواہش،
ماضی پرستی " [2]

آکسفورڈ آن لائن انگلش ڈکشنری میں ناسٹلجیا کے معنی ہیں:

"A form of melancholia caused by prolonged absence from one's home or country, severe homesickness."[3]

اسی طرح کیمبرج انگلش ڈکشنری میں ناسٹلجیا کے معنی دیکھیں تو اس سے مراد ہے:

"A feeling of pleasure and also a slight sadness when you think about things that happened in the past."[4]

ناسٹلجیا سے مراد ماضی میں وقوع پذیر ہونے والی خوشگوار یا ناخوشگوار یادوں کا نام ہے۔

ویبسٹر ڈکشنری کے مطابق ناسٹلجیا کے معنی کچھ یہ ہیں:

"A longing to go back to one's home, home town or homeland, homesickness,a longing for something for away or long."[5]

درحقیقت ناسٹلجیا ایک ایسا فطری عمل ہے جس کے ذریعے انسان اپنے حال میں ہوتے ہوئے بھی ماضی کی جھلکیوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے اور وہ اپنے ماضی میں لوٹ جانا چاہتا ہے تاکہ ان خوبصورت یادوں کے سہارے پر سکون زندگی گزار سکے۔ ناسٹلجیا پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد عاصم بٹ لکھتے ہیں کہ:

"ناسٹلجیا خود کو دہرانے کی خواہش کا نام ہے۔ ناسٹلجیا سے مراد اپنے ماضی کی طرف لوٹنے کا عمل ہے، ماضی سے مراد اپنا وہ سب کچھ جو وہ کھو چکا ہے۔"[6]

لفظ ناسٹلجیا بنیادی طور پر دو یونانی الفاظ کا مرکب ہے اس حوالے سے احمد سہیل کہتے ہیں:

"ناسٹلجیا کا مفہوم غالباً ہمارے یہاں "خانہ اداسی" سے لیا جاتا ہے جو یکسر غلط ہے۔ خانہ اداسی سے مراد Homesickness ہے نہ کہ ناسٹلجیا جو بظاہر لاطینی لفظ معلوم ہوتا ہے حقیقتاً دو یونانی الفاظ Nostos بمعنی "واپسی" اور Algos جس کے معنی "درد" ہیں.... سے مل کر بنا ہے لفظی طور پر ناسٹلجیا کے معنی "درد آلود واپسی" ہوگا اس اعتبار سے لفظ ناسٹلجیا کو ہم "پس کربیہ" بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہ کرب ماضی کی جانب واپسی سے مشروط و منسوب ہے۔"[7]

جب کوئی بھی شخص جو اپنے حال میں رہتے ہوئے گزرے وقت کی یادوں کو اپنے شعور کا حصہ بناتا ہے تو اس شخص کو ناسٹلجی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی بھی ادیب چاہے کسی بھی دور میں سانس لے رہا ہو وہ اپنے ماضی سے فرار حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے شعور ہی کی بنا پر گزرے ہوئے دنوں کو کبھی بھی بھول نہیں پاتا وہ اپنی پرانی طرز زندگی اور رشتوں میں خلوص و محبت کی چاشنی کو وقتاً فوقتاً یاد کرتا رہتا ہے۔ پرانی یادوں میں یا اپنے ماضی میں بار بار جھانکنے کا عمل بہت کٹھن ہوتا ہے کیونکہ زندگی کے اس طویل سفر میں بہت کچھ پیچھے رہ چکا ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بہت سے رشتے کسی نہ کسی موڑ پر ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور ان رشتوں کا کسی خوشی یا غمی کے موقع پر یاد آجانا ایک فطری بات ہے۔ موجودہ دور میں ہمیں ہر شخص ناسٹلجیا کا شکار ہی محسوس ہو گا اس تکلیف دہ عمل سے نجات کے لئے ہی غالب نے اپنے حافظے کے چھن جانے کی دعا کی تھی۔ غالب کا شعر ملاحظہ ہو:

یاد ماضی عذاب ہے یارب

چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ناسٹلجیا کا تعلق بنیادی طور پر یادوں سے ہے یادوں کا سلسلہ ہر فرد کا دوسرے فرد سے مختلف ہوتا ہے۔ ان یادوں کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ دو طرح کی ہوتی ہیں۔ پہلی قسم میں ہم ان خوشگوار یادوں کو رکھ سکتے ہیں جو زندگی کی طویل مسافت کے نتیجے میں پیدا ہوئیں۔ جیسے جو وقت ہم اپنے والدین، اپنے

دوستوں، بہن بھائیوں کے ساتھ بے فکری اور خوشیوں بھرا گزارتے ہیں اور اس وقت کو جب ہم اپنے حال میں سوچتے ہیں تو ایک خوشگوار احساس محسوس ہوتا ہے یہی احساس شخصیت کو مثبت توانائیاں فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ دوسری طرف وہ یادیں بھی ہمارے ذہن کا حصہ ہوتی ہیں جو زندگی کی تلخ یادوں کا منبع ہوتی ہیں۔ اس میں پرانی یادوں کی وہشت، دکھ، کرب، رسوائیاں اور زندگی کے نشیب و فراز دفن ہوتے ہیں۔ یادوں کی ان دونوں صورتوں کا اظہار ادیب اپنے فن پاروں میں کسی نہ کسی طریقے سے کرتا رہتا ہے کیوں کہ فرد اپنے ماضی کو اپنے حال کے سانچے میں دیکھ رہا ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر ہم ناسٹلجیا کو ماضی کی خوشگوار یادوں سے جوڑ سکتے ہیں۔ ماضی کی بدولت ہی ایک شخص اپنے حال کو بہتر انداز میں گزار سکتا ہے اور اپنے مستقبل کو بہترین بنانے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ قاضی جاوید ناسٹلجیا کے بارے میں لکھتے ہیں:

> " بہت سے دوسرے کے خیالات اور احساسات کی طرح ناسٹلجیا کا احساس بھی ہماری سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ وہ ہمیں ماضی کے لمحوں اور مقامات میں سے ایسے اجزا تلاش کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو ہماری موجودہ صورتحال کی ناگواری کا مداوا کر سکے۔"[8]

اس طرح ناسٹلجیا ایک فرد کو حال کے مسائل سے نجات دلا کر وقتی طور پر ماضی کی یادوں کے ذریعے خوشگوار احساس سے ہمکنار کرتا ہے۔ وہ اپنے گزرے ہوئے خوشگوار لمحوں کو یاد کر کے حال کی تلخیوں سے فرار حاصل کر لیتا ہے۔

ج۔ ناسٹلجیا کی قسمیں

ناسٹلجیا کی مختلف صورتحال کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کو ہم مختلف قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں جو ناسٹلجیا کو سمجھنے میں معاون کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ناسٹلجیا کی قسمیں درج ذیل ہیں:

ا۔ وطن واپس جانے کی خواہش

۲۔ ناسٹلجیا ایک نفسیاتی بیماری

۳۔ ماضی کو دہرانے کی خواہش(Restorative)

ا۔ وطن واپس جانے کی خواہش:

لفظ ناسٹلجیا کی ابتدا پر نظر ڈالی جائے تو سترویں صدی میں یہ لفظ سوئس ماہر طب جونس ہافر نے ان فوجیوں کے لیے استعمال کیا تھا جو اپنے وطن سے دور تھے۔ جونس ہافر نے یہ اصطلاح وطن واپس جانے کی خواہش یا درد آلود واپسی Homesickness کے طور پر متعارف کروائی تھی۔ وطن سے یا گھر سے دوری کا احساس انسان کو شدت سے اس دوری کا احساس دلاتا رہتا ہے جو فوجی اپنے گھروں سے دور جنگ لڑ رہے ہوتے ہیں انہیں گھر سے دوری کا احساس ناسٹلجیا کا شکار کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ اپنے حالات سے مجبور ہو کر ہجرت کرتے ہیں اور کچھ لوگ اپنی مرضی سے اپنی طرز زندگی کو بہتر بنانے کی غرض سے دوسرے ملکوں کا رخ کرتے ہیں تو وہاں انہیں اپنے گھر سے دوری، زبان کے مسائل اور اجنبیت کا احساس اس شخص کو ناسٹلجی بنا دیتا ہے۔ اس حوالے سے آن لائن انسائیکلوپیڈیا نے اس طرح وضاحت کی ہے جو ذیل میں درج ہے:

"Harvard professor Svetlana Boym in her remarkable book The Future of Nostalgia, says that the word was coined in 1688 by the Swiss doctor Johannes Hofer to identify the homesickness of Swiss soldiers who reacted physically to the hearing of certain folk melodies and the eating of rustic soups while on missions away from home. She centers her study on the effects of leaving one culture and residing in another and of exploring cities rich in archaeological layers of memory."[9]

دور حاضر کا جائزہ لیا جائے تو بہت سے لوگ ذریعہ معاش بہتر بنانے کی غرض سے دوسرے ملکوں کا رخ کرتے ہیں۔ وہ اپنی طرز زندگی کو بہتر بنانے کی غرض سے اپنا گھر بار، اپنے قریبی رشتے، دوست احباب نیز وہ سب کچھ چھوڑ کر اپنے ساتھ یادوں کی گٹھڑی لے جاتا ہے۔ یہ یادیں کسی طور پر بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی

ہیں۔ دوسرے ملک میں ہر لمحہ اسے اجنبیت کا احساس ہوتا رہتا ہے تو وہ بیتے لمحوں میں پناہ لینا شروع کر دیتا ہے۔ ہجرت چاہے کسی بھی وجہ سے ہو یہ اس قدر کٹھن اور تکلیف دہ عمل ہوتا ہے جس کے نتیجے میں اپنا وطن چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں سکونت اختیار کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ چاہے اس دوسرے ملک میں اپنے وطن سے زیادہ پر آسائش طرزِ زندگی میسر ہو پھر بھی کسی نہ کسی طور پر اپنے وطن کی یاد آنا ایک فطری عمل ہے۔ یادوں کا سلسلہ اس فرد کو ناسٹلجی بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ یادیں صرف جانداروں سے ہی منسوب نہیں ہوتیں بلکہ بے جان اشیا سے بھی کبھی کبھی اتنا لگاؤ ہو جاتا ہے کہ وہ چیزیں بھی کسی نہ کسی طور پر خود سے دوری کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ وطن سے دوری کا احساس ایک کرب دہ عمل ہے اور اس فرد کو بار بار اس دوری کا احساس اپنے وطن واپسی کی خواہش کو نمو بخشتا ہے لیکن اس کے حالات اسے لوٹنے کی اجازت نہیں دیتے تو وہ صرف بیتے لمحوں اور گزرے ہوئے دنوں کو اپنے حال میں دیکھ کر ہی خوشی محسوس کرنے لگتا ہے۔

۲۔ ناسٹلجیا ایک نفسیاتی بیماری

ناسٹلجیا دراصل علم نفسیات کی اصطلاح ہے۔ علم نفسیات میں اس اصطلاح کو ذہنی امراض کے مریضوں کا علاج کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسے مریض زیادہ تر اپنے ماضی کی اذیت ناک یادوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہمارے ماضی کا تعلق ہماری نفسیات سے ہے اور ماضی بہت سانحات اور واقعات کا منبع ہوتا ہے کیونکہ انسانی زندگی میں بہت سے اچھے اور برے حالات آتے رہتے ہیں ان حالات میں رونما ہونے والے بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کو بھلا پانا بہت مشکل ہوتا ہے تو وہ واقعات گاہے بگاہے یاد آتے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انسانی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور انھی یادوں کی بدولت ہی فرد نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔

اگر دور حاضر میں معاشرے اور گردونواح کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ہر شخص ہی ماضی میں کھویا ہوا دکھائی دیتا ہے بعض افراد اپنے حال میں رہتے ہوئے وقتاً فوقتاً ماضی کے واقعات کو حال کے پیرائے میں دیکھتے رہتے ہیں مگر وہ اپنے حال سے بھی مطمئن ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے حال سے خوش نہیں ہوتے اور وہ ہر لمحہ اپنے ماضی کو ہی یاد کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے گفتگو کرنے سے اس بات

کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی باتوں کا زیادہ تر حصہ ماضی کے واقعات پر ہی منحصر ہوتا ہے اور ایسے لوگ اکثر کہتے سنائی دیتے ہیں کہ وقت بدل گیا ہے پہلے وقتوں میں اپنائیت اور خلوص موجودہ دور کی نسبت زیادہ تھا۔ کیونکہ اکیسویں صدی میں بہت سے سماجی و تہذیبی تقاضے تبدیل ہوئے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ مزید تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں انسانی رشتے اس کے نتیجے میں دوری کا شکار ہو رہے ہیں اور فرد تنہائی کا شکار ہو کر اپنے ماضی کی یادوں میں پناہ لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

کسی بھی دور کا ادب سماجی زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اور یہ ترجمانی نفسیات کے سہارے ہی ممکن ہوتی ہے ادب میں انہی حالات و واقعات کو بیان کیا گیا ہوتا ہے جو واقعات ماضی میں رونما ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ انسانی خواہشات جو تکمیل کے مراحل تک نہیں پہنچ پاتی ہیں وہ خواہشات بھی ماضی کا حصہ بن کر لاشعور میں محفوظ ہو جاتی ہیں جو کہ ذہنی تناؤ کا سبب بنتی ہیں۔ فرائیڈ نے اپنے نظریات کے ذریعے انسانی ذہن کے ایسے حصوں کو متعارف کروایا جن کو ان سے پہلے کسی نے بھی دریافت نہیں کیا تھا۔ شعور، تحت الشعور اور لاشعور کی بنیاد پر تحلیل نفسی کا نظریہ پیش کیا۔ فرائیڈ کے مطابق جو بھی واقعات رونما ہوتے ہیں وہ تمام واقعات تحت الشعور میں جمع ہوتے رہتے ہیں اور وہ وقتاً فوقتاً خوابوں کی صورت میں نمو پاتے رہتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> "فرائیڈ کا بنیادی نظریہ جنسی قوت یا LIBIDO پر مبنی ہے۔ اڈ ID نفس قوت کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ اسے معروضی حیثیت کا علم تک نہیں ہوتا۔ یہ انسانی تجربے کے بارے میں صرف یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ درد بخشتا ہے یا لذت۔ اڈ کے دائرے کے اندر ایگو EGO اور سپر ایگو SUPER EGO ایک دوسرے سے ممیز ہوتے ہیں۔ ایگو ذہن کے اندر اشیاء کو خارجی دنیا کے اشیاء سے ممیز کرتا ہے۔ تجربے کے بارے میں ایگو صرف یہ پوچھتا ہے کہ وہ سچ ہے یا جھوٹ۔ ایگو جبلی ضرریات اور خارجی ماحول میں گویا رابطہ قائم کرتا ہے۔ سپر ایگو معاشرے کے اقتدار کی نمائندگی کرتا ہے یہ گویا شخصیت کا اخلاقی پہلو ہے اور تجربے کے بارے میں صرف یہ دریافت کرتا ہے کہ وہ اچھا ہے یا برا۔"[۱۰]

فرائیڈ کے نزدیک ادب ان ادھوری خواہشات کا سرچشمہ ہے جو خواہشات تکمیل تک نہیں پہنچ پاتی اور قاری بھی ان ادب پاروں سے اپنی دبی ہوئی خواہشات کو تسکین مہیا کرنے کا کام لیتا ہے۔ اردو ادب میں قیام پاکستان کے بعد ہر صنف ادب میں کسی نہ کسی طور پر ناسٹلجیا کا اظہار کیا گیا۔ ترقی پسندوں نے ناسٹلجیا کو نفسیاتی بیماری تصور کیا۔ اگر اس لفظ کی ابتدا کا جائزہ لیا جائے تو اسے نفسیاتی بیماری کے طور پر متعارف کروایا گیا تھا لیکن اب ناسٹلجیا کو ماضی کی خوشگوار یادوں کے استعارے کے طور پر برتا جاتا ہے۔ جوزف بنکس لکھتے ہیں:

"By 1850s nostalgia was losing its status as a particular disease and coming to be seen rather in 1st and 2nd world war still being recognize."[11]

۳۔ ماضی کو دہرانے کی خواہش (Restorative)

ہمارا حال چاہے کتنا ہی خوبصورت اور پر آسائش کیوں نہ ہو پھر بھی ماضی سے پیچھا چھڑانا خاصا مشکل امر ہے۔ بعض اوقات زندگی میں ایسے واقعات گزرے ہوتے ہیں جو تلخ یادوں کی صورت میں ہمارے ذہن میں نقش کر جاتے ہیں کہ ان واقعات کو سوچنے سے ہی تلخی کا احساس ہوتا ہے اور انسان کی کوشش ہوتی ہے کہ ایسے واقعات دوبارہ رونما نہ ہوں۔ بصورت دیگر ان تلخ یادوں کے ساتھ ساتھ انسانی ذہن ان خوشگوار حالات و واقعات کی یادوں کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتا ہے۔ ان خوشگوار یادوں کو دوبارہ رونمائی کی شدید خواہش سر اٹھانے لگتی ہے۔ ناسٹلجیا کی اس قسم کا تعلق ماضی کی یادوں کی بازیافت سے ہے یعنی بیتے ہوئے لمحوں کو از سر نو جینے کی خواہش زور پکڑنے لگتی ہے اور ان واقعات کو حال میں سوچ کر ہی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ماضی کے واقعات کو از سر نو دہرانے کی خواہش اس وقت شدت اختیار کرتی ہے جب حال کے حالات و واقعات ناساز ہوں۔ فرد اپنے حال کے حالات و واقعات سے فراریت کے لیے ماضی میں پناہ لینا شروع کر دیتا ہے جس سے اسے آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

" ماضی کے دریچوں میں جھانکنا اور ایک مطمئن زندگی اور شخصیت کے تصور کو سامنے لانا، حال کی بربریت کو کسی قدر کم کرنے کی کوشش تھی۔ مستقبل کے حوالے سے خواب

دیکھنا انسان کا فطری تقاضا ہے۔ بدتر حالات میں یہ خواہش اور بھی زیادہ ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ تقسیم کے بعد بحرانی حالات میں امید وناامیدی کے دونوں رویے دو انتہاؤں پر رہتے ہوئے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ چنانچہ یہاں انفرادی واجتماعی الیے کا کرب بھی ہے اور خوبصورت لمحوں کی بازیافت کی تڑپ بھی۔"[۱۲]

ایک فرد اپنے ماضی کے کچھ خوشگوار لحات کو اپنی زندگی میں دوبارہ جینا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ خوشگوار وقت اور مطمئن زندگی کبھی بھی ختم نہ ہو۔

د۔ ناسٹلجیا کے محرکات وعوامل

کسی شخص پر ناسٹلجیا کے اثرات منفی اور مثبت دونوں طرح کے ہو سکتے ہیں ان اثرات کی نوعیت کا تعلق اس شخص کی یادوں سے جڑا ہوتا ہے اگر ایک شخص اس بات کا تعین کر لیں کہ ماضی صرف ماضی ہے وہ برے اچھے حالات اب ماضی کا حصہ ہیں تو وہ ان کو از سر نو جینے کی بجائے اپنے حال سے زیادہ مطمئن نظر آئے گا۔ تو وہ ماضی میں حاصل کیے گئے نتائج کے ذریعے اپنے حال اور مستقبل کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا رہے گا۔ ناسٹلجیا کے محرکات اور عوامل کی بات کریں تو قیام پاکستان کے بعد ناسٹلجیا کے محرکات وعوامل میں ہجرت اور فسادات کے واقعات اہمیت کے حامل رہے۔ اگر ہم اکیسویں صدی میں ناسٹلجیا کے محرکات اور عوامل کی بات کریں تو اس صدی کا آغاز ہی نائن الیون جیسے سانحے سے ہوا۔ جس کے نتیجے میں عالمی سیاسی و سماجی صورتحال میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس واقعے کے بعد جو دہشت گردی کے واقعات وقوع پذیر ہوئے اس کے نتیجے میں بہت سے عوامل و محرکات ناسٹلجیا کو پروان چڑھانے میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ آیئے محرکات وعوامل کا جائزہ لیتے ہیں۔

ا۔ ہجرت اور فسادات

برصغیر پاک وہند برطانوی تسلط کے زیر اثر رہا تو یہ خطہ برطانوی نو آبادی بن گیا تھا۔ اس نو آبادیاتی نظام کے قیام کے ساتھ ہی یہاں دو دنیاؤں کا وجود عمل میں آیا۔ بنیادی طور پر طاقتور قوم کسی کمزور ریاست پر قابض ہو کر وہاں کے قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھاتی ہے اور مقامی باشندوں کو کم تر اور حقیر ہونے کا احساس

دلاتی ہے۔ اس نظام کے زیر اثر مقامی باشندے نفسیاتی طور پر کمزور ہو جاتے ہیں۔ مقامی باشندے نو آباد کار کے ماتحت وہی کام کرتے ہیں جو کام کرنے کا انہیں کہا جائے۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایسی صورتحال میں انہیں آزادی کا شدت سے احساس ہوتا تھا اور پھر اس خطے کے مذہبی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورتحال نے بھی آزادی کی تحریکوں میں اہم کردار ادا کیا۔ دوسری طرف بگڑتی ہوئی عالمی صورت حال نے بھی آزادی کی تحریکوں کو جلا بخشی۔ بظاہر ۱۹۴۷ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو آزادی تو ملی لیکن اس آزادی کے نتیجے میں بے شمار لوگوں نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے اور بے شمار عورتوں کی عصمتوں کو بھی پامال کیا گیا۔

ان گنت قربانیوں کے سبب ان گنت احساسات اور جذبات کو بھی قربان کیا گیا۔ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم اور اس کے نتیجے میں تقریباً سوا کروڑ افراد کا ہجرت کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا تاریخ کا ایک اہم واقع ہے۔ اس ہجرت کے نتیجے میں بے شمار قیمتی جانوں کو قربان ہونا پڑا اور ایسے فسادات رونما ہوئے جن کا تصور بھی انسانی ذہن نہیں کر سکتا۔

ہجرت اور فسادات کے بعد مہاجرین کے لیے ایک نیا محاذ تیار تھا۔ ان کو کیمپوں میں منتقل کیا گیا اور ان کیمپوں میں مہاجرین کو بیماری، بھوک کے ساتھ ساتھ غلاظت کو بھی برداشت کرنا پڑا۔ مہاجرین کے لیے عزت، شرافت، غربت نیز ہر طرح کی سماجی حیثیت یکسر تبدیل ہو گئی تھی۔ جو لوگ بڑی بڑی کوٹھیوں اور جاگیروں کے مالک تھے انہیں ہجرت کے بعد جھگیوں اور کوارٹروں میں گزارا کرنا پڑا۔ وہ مہاجرین جو ایک نئی طرز زندگی کا خواب آنکھوں میں بسائے ہوئے یہاں آئے تو یہ سرزمین ان کے لئے اجنبی تھی۔ مقامی لوگوں اور مہاجرین کے آپس میں ثقافتی و سماجی فرق اور بالخصوص سماجی شناخت کا فرق ہی انہیں ایک دوسرے سے مختلف اور جدا کر دیتا تھا۔

اس سماجی صورتحال نے ایک نیا طبقاتی نظام تشکیل دیا۔ ایسے بے شمار افراد جن کی حیثیت قیام پاکستان سے پہلے اہم اور معزز معاشرتی فرد کے طور پر تھی ان کی حیثیت قیام پاکستان کے بعد بے وقعت ہو گئی ان لوگوں کو وہ مقام نہ مل سکا جو قیام پاکستان سے قبل ان کا مقدر تھا۔ بہت سے ایسے افراد جو قیام پاکستان سے قبل

معاشرے میں نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے لیکن قیام پاکستان ساتھ ہی ان کی سماجی حیثیت یکسر بدل کر اعلیٰ طبقے کے نمائندگان میں بدل گئی۔

ہجرت کے بعد نہ صرف سماجی امتیازات اور جغرافیائی حدود میں تبدیلی دیکھنے کو ملی بلکہ اس ہجرت نے تو خاندانوں کو بھی تقسیم کر دیا۔ ایک ہی خاندان کے متعدد افراد ہجرت کر کے دوسرے وطن چلے گئے تو اس طرح اس خاندان میں سماجی رابطے بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئے۔ اس طرح مہاجرین کو یہ مسئلہ بھی درپیش ہوا کہ انھوں نے مقامی لوگوں سے سماجی رابطے کس طرح تشکیل دینے ہیں۔ اس تمام تر صورتحال کے بعد مہاجرین کا مستقبل غیر یقینی صورتحال سے دوچار تھا۔ نہ ان کا حال بہتر تھا اور نہ ہی مستقبل کو بہتر بنانے کے کوئی آثار نظر آ رہے تھے۔ تو ایسی صورتحال میں مہاجرین کا شاندار ماضی ہی انھیں اپنی آغوش میں پناہ دیتا۔ تو یہ مہاجرین ناسٹلجیا کا شکار ہو گئے۔ کیونکہ اپنی جڑ سے اکھڑ جانے کے بعد اس نئے معاشرے میں ان کی حیثیت معمولی افراد جیسی ہو گئی تو وہ اپنے لمحہ حال کا زیادہ حصہ ماضی کی یادوں کے سہارے ہی اپنی زندگی کے سفر کو آگے بڑھانے لگے۔ ان تمام سماجی و سیاسی صورتحال کی عکاسی ادیبوں نے اپنے فن پاروں میں کیں۔ ادیب چونکہ معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے وہ ان حالات و واقعات کو ہی ان فن پاروں میں بیان کرتا ہے جن کو وہ محسوس کرتا ہے۔

نقل مکانی اور فسادات کے واقعات کا رنگ قیام پاکستان کے بعد اردو افسانے پر غالب رہا۔ مہاجرین درپیش مسائل کے سبب ابھی زندگی کی دوڑ میں شامل بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۱ کی جنگ اور ہجرت نے قوم کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یوں ۱۹۶۵ کی جنگ اور ہجرت در ہجرت جیسے واقعات نے انسانی نفسیات پر گہرے اثرات ڈالیں۔ یہ سارے واقعات بھی فرد کو ناسٹلجیا کا شکار بنانے میں معاون ثابت ہوئے۔ جو لوگ پر آسائش طرزِ زندگی کو چھوڑ کر یہاں آ کر آباد ہوئے اور وہ معاشرے میں کوئی مقام حاصل نہ کر سکے تو ایسے افراد ماضی کی خوشگوار یادوں کے بارے میں سوچ کر لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ یادوں کی بازآفرینی کو اس دور کے ادیبوں نے ادب کے ذریعے پیش کیا۔ نہ صرف مہاجرین کو ان فسادات اور ہجرت کے واقعات نے متاثر کیا بلکہ مقامی لوگوں کو بھی بے اطمینانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان تمام واقعات نے انسانی نفسیات اور جذبات کو تناؤ سے نواز دیا جس سے فرد تنہائی کا شکار ہو گیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد عالم خان رقمطراز ہیں:

"قیام پاکستان کے بعد ابھرنے والے تمام رجحانات میں ایک بات جو بہت اہمیت کی حامل ہے وہ فرد کی بسی اور تنہائی ہے جس کے نتیجے میں اسے اپنے تشخص کے بحران سے دوچار ہونا پڑا۔اسے نئی سرزمین میں پناہ نہ مل سکی،وہ تہذیبی و ثقافتی انتشار کا شکار ہوا بلکہ اسے ذہنی و فکری جلاوطنی کی زندگی بسر کرنا پڑی۔ وہ اپنے وطن میں رہتے ہوئے بھی احساس بیگانگی سے دوچار رہا۔اس کے خواب بکھر گئے۔ وہ زندگی کے قافلے سے بچھڑ گیا برصغیر کی تقسیم نے فرد کو احساسات وجذبات کی سطح پر بھی تقسیم کر دیا۔"[۱۳]

اس تمام المناک صورتحال سے فراریت کی جو صورت نظر آئی وہ ماضی میں جھانکنے کی صورت میں نظر آئی۔ فسادات اور نقل مکانی کے بعد انسانی بے بسی،خوف اور وحشت وبربریت کی جو فضا چھاگئی تھی تو اس قسم کے حالات میں ان لوگوں میں حال کو بہتر بنانے کے لئے جواں مردی پیدا کرنے کی ضرورت تھی تو دوسری طرف انھیں مستقبل کے حوالے سے روشن امکانات کی یقین دہانی کروانے کی بھی ضرورت تھی۔ ہجرت اور فسادات کے نتیجے میں اردو ادب میں ایک بڑا موضوع سامنے آیا۔ اردو افسانوں اور ناولوں میں ہجرت کا کرب،مہاجرین کے مسائل اور سماجی رویوں کو بیان کیا گیا۔ جس اذیت سے ہجرت کر کے آنے والے گزرے تھے۔جو ادیب اس تجربے کی کرب ناکی سے خود گزرے تھے تو ان تمام احساسات و جذبات اور واقعات کو اپنے فن پاروں میں بیان کیا۔اس حوالے سے ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

"تقسیم کے فورا بعد کے افسانوں میں یہی صورت ملتی ہے لیکن خصوصی سطح پر اس کو ایک بڑے فکری پھیلاؤ کی حیثیت بھی حاصل ہوئی۔ یہ فکر اس کرب سے عبارت بھی جو اپنی بنیادوں سے جدا ہونے کے بعد بعد کسی بھی ذی روح کو بے چین کر دیتا ہے۔کرب کا یہ پہلو زیادہ تر ان افسانہ نگاروں کے ہاں نمایاں ہوا جو ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ اپنے آباؤ اجداد کے سرزمین اور اس سے متعلق تہذیب کی یادیں ایک مسلسل روگ کی صورت میں سامنے آئیں اور ماضی پرستی کا وہ رویہ جو اصطلاحاً ناسٹلجیا(Nostelgia) کہلاتا ہے۔اردو افسانے کا حصہ بنتا چلا گیا۔"[۱۴]

ہجرت کا واقعہ صرف ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہونے تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اس زمینی بے دخلی کے احساس نے فرد کی شخصیت کو منہدم کر دیا تھا کیونکہ اس فرد کا رشتہ اس زمین سے ہی ختم نہیں ہوا تھا بلکہ وہ ایک تہذیب، روایات سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ یوں ہجرت کرنے والے ادیبوں کے ہمیں ناسٹلجیا کا اظہار شدت سے دکھائی دیتا ہے۔ ہجرت کا واقعہ مہاجرین کے لیے ایک ایسا روگ بن کر رہ گیا جس سے ان مہاجرین کے لیے چھٹکارا پانا ناممکن ہو گیا۔ مہاجرین اپنی تہذیب، گھر، محلے کو چھوڑ کر نئی جگہ آباد ہوئے تو دوری کا احساس اس پوری نسل کو برداشت کرنا پڑا۔ اس صورتحال کو افسانہ نگاروں نے ناسٹلجیائی کرداروں کی صورت میں پیش کیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

> "اردو افسانے میں فسادات کے ساتھ ساتھ ہجرت کا موضوع بھی ایک آسیب کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ یہ محض ماضی سے متعلق ایک جذباتی رویے کا عکس نہ رہا اور نہ ہی بچھڑنے والے تہواروں، گلی کوچوں، باغوں، پرندوں اور لوگوں کی کشش میں اسیر رہنے کا کرشمہ رہا۔ بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ایک پیچیدہ نفسیاتی رجحان بنتا گیا اور یہ بھی کہ نئے ماحول سے تہذیبی اور ثقافتی مواسنت پیدا نہ ہو سکنے کے نفسیاتی اسباب بھی ہوں گے مگر اس کے وجوہات سیاسی اور معاشی زیادہ ہیں۔"[۱۵]

ایک فرد جس جگہ پیدا ہوتا ہے اس جگہ سے اسے جذباتی لگاؤ ہوتا ہے اسی لگاؤ کی بنا پر لوگ سال ہا سال اسی علاقے میں رہتے ہیں۔ ۱۹۴۷ کی ہجرت کے بعد ان لوگوں نے ناسٹلجیا کی کیفیت کا جنم لینا ایک فطری عمل ہے۔ ہجرت کے بعد اردو افسانہ نگاروں انتظار حسین، قرت العین حیدر، احمد ندیم قاسمی، اسد محمد خان وغیرہ کی تحریروں میں ہجرت کے بعد کے جذبات واحساسات اور ماضی کی یادوں کا اظہار ملتا ہے۔

۲۔ عصری صورتحال

اکیسویں صدی کا جائزہ لیا جائے تو دور جدید ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ نت نئی سائنسی ایجادات واختراعات نے انسانی زندگی کو نت نئی چیزوں سے روشناس کروایا۔ آئے دن نئے نئے تجربات کی مدد سے نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔ جدید برقی، انٹرنیٹ کی ترقی کی بدولت پوری دنیا گلوبل ویلج بن گئی۔ ایک بٹن دبانے کی دوری پر

ہر طرح کی معلومات کا حصول ممکن ہو گیا۔ نیز زندگی کے ہر میدان میں سائنسی ٹیکنالوجی کی بدولت ہونے والی ترقی اس صدی میں اپنے عروج پر ہے۔ اس صدی میں اگر دیکھا جائے تو زندگی کے ہر شعبے میں تیز رفتاری اپنی مثال آپ ہے۔ اکیسویں صدی کا آغاز بہت دھوم دھام سے اور سلامتی کی دعاؤں سے ہوا لیکن اس صدی میں پیش آنے والا نائن الیون کا واقعہ جس نے تمام تر عالمی صورتحال کی کایا پلٹ دی۔ ۲۰۰۱ میں امریکہ میں چار مسافر طیاروں کے ذریعے خودکش حملے کیے گئے اور ان حملوں کے بعد دہشت گردی کے بادل ہر سمت چھانے لگے۔ اس واقعے نے ہر خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس طرح امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا اس واقعہ کا ذمہ دار القاعدہ کو قرار دیا گیا۔ افغانستان پر امریکہ نے حملہ کیا جس کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ مختصراً یہ کہ اس واقعہ کے بعد پاکستان میں بھی دہشت گردی کے واقعات زور پکڑنے لگے آگے۔ آئے روز ملک کے مختلف حصوں میں خودکش حملے ہوئے اور انسانی جانوں کو اس دہشت گردی کے سبب قربان ہونا پڑا۔

اس صدی کی دوسری دہائی میں کرونا وائرس نے کرہ ارض کو ہلا کر رکھ دیا اور وائرس عالمی وبا کی صورت اختیار کر کے بے شمار جانوں کو نگل گیا۔ ان دونوں واقعات یا صدی کے انسانوں کی نفسیات، ان کے سماجی و ثقافتی روابط پر منفی اثرات مرتب کیے۔ اس قسم کے حالات میں بے یقینی اور خوف کی فضا پروان چڑھی۔ روز بہ روز ہونے والی ایجادات نے جہاں انسان کو پر آسائش طرزِ زندگی دیا وہیں انسانی ضروریات کی فہرست بھی طوالت اختیار کرتی گئی۔ ان ضروریات کو پورا کرنے کی خاطر گذشتہ چند برسوں میں کثیر تعداد میں لوگوں نے دوسرے ملکوں کا رخ کیا اور اب تو گویا دبئی جانے کا رواج چل نکلا۔ وہاں نقل مکانی کرنے والے جب پردیس ملک میں بسیرا کرتے ہیں تو وہاں کی ہر چیز انھیں اجنبی معلوم ہوتی ہے اور سب سے بڑا مسئلہ انھیں شناخت کا درپیش ہوتا ہے یوں وہ لوگ گھر سے دوری کی وجہ سے ناسٹلجیا کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے قریبی رشتوں اور اپنے وطن کی یادوں میں کھوئے رہتے ہیں مگر وہ لوگ اپنے وطن واپس اس لیے نہیں لوٹتے کیونکہ موجودہ دور میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کا مقابلہ لگا ہوا ہے سب دولت کے پجاری بن بیٹھے ہیں۔
ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

"گلوبیت کے نام پر جس کا دعویٰ ہے کہ انسانوں کے مابین ہر طرح کی تفریق مٹائی جاسکتی ہے۔ زبان، نسل، قوم، علاقہ ،یا کوئی اور حوالہ جو انسانوں کو تقسیم کرتا ہو، قوموں کو تقسیم کرتا ہو، سب بے معنی ہو رہا ہے مگر یہ دعوی دار دنیا کو اسی طرح تقسیم کیے ہوئے ہیں ایک دنیا زر داروں کی ہے جو پروڈیوسرز ہیں اور دوسری دنیا بے زروں کی ہے جو صارف ہیں"۔[۱۶]

اس صدی میں یوں تو سائنسی ترقی زوروں پر دکھائی دی اور انسانی زندگی کو آسانیوں سے ہمکنار کرتی رہی۔ کہا جاتا ہے کہ موبائل فون، انٹرنیٹ جیسی ایجادات نے سماجی دوریوں کو کم کر دیا لیکن دور حاضر کا جائزہ لیا جائے تو ان ایجادات کی بدولت انسان تنہائی کا شکار ہو گیا۔ دور جدید کی تیز رفتاری میں فرد بھی ان مشینوں کے درمیان کہیں کھو گیا ہے۔ زندگی اس قدر الجھاؤ کا شکار ہو گئی ہے کہ فرد تنہائی کا شکار ہو گیا ہے اور یہ تنہائی دور حاضر کے انسانوں کو اس کے ماضی کی طرف دھکیل دیتی ہے۔

۳۔ نائن الیون اور بدلتی عالمی صورتحال

اکیسویں صدی کو بہت دھوم دھام سے خوش آمدید کیا گیا۔ سائنسی نت نئی ایجادات نے بظاہر انسانی زندگی کو پرسکون بنا دیا۔ جدید ٹیکنالوجی اور سائنسی ایجادات جو انسانی زندگی کو پر آسائش بنا رہی تھی کسی کو معلوم نہیں تھا کہ سائنسی ایجادات کی بدولت اس صدی میں قیمتی جانوں کو قربان ہونا پڑے گا۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ تاریخ کا ایک ایسا اہمیت کا حامل دن ہے جس دن نے پوری دنیا کی سماجی و سیاسی صورتحال کو بدل کر رکھ دیا۔ امریکہ کے شہر نیویارک میں واقع ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی جڑواں عمارتوں میں جہاں ہزاروں افراد اپنے کاموں کا آغاز کر چکے تھے کہ اچانک ایک طیارہ عمارت کے ایک حصے سے ٹکراتا ہے اور پھر کچھ وقفے کے بعد ایک اور طیارہ عمارت کے دوسرے حصے سے ٹکراتا ہے جس کے نتیجے میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی دونوں عمارتوں میں آگ بھڑک اٹھی اور ہزاروں انسانی جانوں کا ضیاع ہوا۔ اس طرح تیسرا طیارہ پینٹاگون عمارت سے ٹکرایا اور چوتھا طیارہ گر کر تباہ ہو گیا۔ امریکہ میں ہونے والی اس تمام تر تباہی کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرایا گیا اور مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دے دیا گیا۔ امریکہ نے اس دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اعلان کرتے ہوئے افغانستان

اور عراق کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس جنگ میں لاکھوں مسلمانوں جن میں بچے، بوڑھے، عورتیں اپنی جانوں کو قربان کر چکے تھے اور ان بے گناہ لوگوں کے قتل کو جائز قرار دیا گیا۔ نائن الیون کے واقعے کے بعد بہت سے تحقیقاتی کمیشن بنائے گئے۔ تحقیقاتی رپورٹس کے نتائج جو بھی سامنے آئے اس واقعہ کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرا کرے اکتوبر ۲۰۰۱ میں افغانستان پر حملہ کیا گیا اور پھر ۲۰۰۳ میں عراق کو امریکہ نے اپنی حوس کا نشانہ بنایا بنا کر ایک ایسے انسانی سوز داستان رقم کی جس کی نظیر ہمیں قدیم یا جدید کسی دور میں نہیں ملتی۔اس طرح ایک طرف اکیسویں صدی میں جہاں کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور میڈیا نے جہاں جدت اختیار کی تو دوسری طرف عالمی سماجی و سیاسی صورتحال اور انسانی قدروں کو بھی پامال کر دیا۔ ان بدلتے حالات نے ہمارے لکھاریوں کو بھی نئے نئے موضوعات سے متعارف کروایا۔ اس حوالے سے محمد ساجد لکھتے ہیں:

"اردو افسانے میں موضوعاتی تبدیلیاں رونما ہوئیں اس کے ساتھ ہی ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا گلوبل ویلج دنیا نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا جہاد اور دہشت گردی کی اصطلاحیں سامنے آئیں۔ لسانی اور تہذیبی تصادم ہوئے۔ مسلمانوں کی الگ شناخت ٹھہری سب کچھ یہاں شانت نہیں ہوا بلکہ طاقت کے نشے میں سپر پاور نے افغانستان اور عراق کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔"[۱۷]

نائن الیون کے بعد دہشت گردی کے خاتمے کے لیے کیمیائی آلات پوری دنیا کے امن و امان کے لیے خطرے کے سبب بنے اور یوں مذہبی شدت پسندی کی بنیاد پر عالمی امن کو ایک نہ ختم ہونے والی جنگ میں دھکیل دیا گیا۔ جس کا خمیازہ لاکھوں انسانوں کو بھگتنا پڑا۔ نائن الیون کے بعد کی صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ جانی و مالی نقصان مسلم ممالک کا ہوا۔ افغانستان اور عراق کے بعد پاکستان وہ ملک ہے جس کو تقریباً ستر ہزار انسانی جانوں کو قربان کرنا پڑا اس طرح پاکستان کو دہشت گردی کے خلاف جنگ کی بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ یہاں آئے روز ہونے والے خود کش حملوں نے جہاں انسانی جانوں کو اپنا شکار بنایا تو دوسری طرف معاشرے میں خوف و ہراس کو بھی پروان چڑھایا۔ اس خوف و ہراس کی وجہ سے بے یقینی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ جس کی بنا پر فرد اپنے حال سے کٹ کر ماضی کے ان دنوں کو یاد کرنا

شروع کر دیتا تھا جس دور میں کیمیائی آلات کی جدید ایجادات نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا تھا۔ ڈاکٹر مجاہد کامران نائن الیون کے مخفی عزائم کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

> "دنیا میں تیل کی بڑھتی ہوئی مانگ اور سرعت سے گھٹتے ہوئے ذخائر بڑی تیزی کے ساتھ بنی نوع انسان کو ایک انتہائی خطرناک صورتحال کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ تیل کے بے دریغ استعمال کی امریکی عادت اور دنیا کے تمام تر وسائل پر مغرب کے دولت مند ترین خاندانوں کی قابض ہونے کی خواہش نے بنی نوع انسان کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں جنگ، وسطی ایشیا میں امریکی موجودگی، گلوبلائزیشن اور نیو ورلڈ آرڈر کی اصطلاحیں، دہشت گردی، القاعدہ کا پراسرار وجود، اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ اورامریکہ میں شہری آزادی کی سرعتت سے سلبی تمام ایک ہی بنیادی مقصد کے حصول کے لیے ہیں۔"[۱۸]

۹/۱۱ کے فوراً بعد ہی اکیسویں صدی کے انسانوں کو تہذیبی تصادم کے مناظر کو دیکھا پڑا۔ جس سے نہ صرف سیاسی اور سماجی حالات میں تناؤ پیدا ہوا بلکہ انسانی ذہن پر بھی اس کے منفی اثرات مرتب ہوئے۔ اس طرح اس سانحہ نے انسانی فکری زاویوں کو تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی تاریخ کے دھاروں کو بھی بالکل نئی سمت کی طرف موڑ دیا۔ ان تمام واقعات کو اور عالمی سیاسی حقائق دیگر ادیبوں اور دانشوروں نے بیان کیا۔ کچھ ادیبوں اور دانشوروں نے ٹھوس حقائق کی بنیاد پر تحریر کیا تو کچھ نے حقائق کے پس منظر کو جاننے کی کوشش کیے بغیر ہی اس موضوع کو بیان کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر مجاہد کامران لکھتے ہیں:

> "عوامی ذہنوں کی طنابیں کھینچنا ہی اسی اشرافیہ کی حکمت عملی کا سب سے ضروری جزو ہے جس کی بنا پر وہ نئے "عالمی نظام" کا قیام عمل میں لانا چاہتے ہیں۔۔۔۔ اس طرح پیدا ہونے والے ورلڈ اور سبک دست انداز فکری و ذہنی رجحان کے ذریعے عوام کو قابو کر دیا ہے۔۔۔۔"[۱۹]

۹/۱۱ کے بعد کے لکھاریوں نے اس سانحہ کے عوامل و محرکات پر بہت سی تحاریر کو پیش کیا اور انہوں نے عالمی دنیا کو ایک ایسی جنگ کے گھیر آؤ میں مبتلا کہا جو بظاہر جنگ نہیں ہے لیکن اندرونی طور پر اس جنگ کے

مقاصد مسلم ممالک کی جڑوں کو کھوکھلہ کرنا ہے۔اس واقعہ کی حدود وقیود کے ضمن میں ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

"مابعد کی اس دنیا میں جو بلند و بالا عمارتوں کا گرنا، دراصل دو خلاؤں کی تشکیل ہے۔ ایسی تخریب جس کی بنیاد پر نئی تعمیر ہو سکتی ہے؟۔ واقعہ ایک عہد کی فصیل اور دوسرے عہد کا دروازہ ہے۔ یہ بات بش اور اوبامہ کی تقاریر سے لے کر سکول کے بچوں کے مباحثے تک کئی بار کہی اور سنی گئی ہے کہ گیارہ ستمبر کا دن عہد جدید کی تاریخ کا اہم ترین دن ہے۔۔۔۔۔اس الٹی ہوئی بساط کو اس نے رشتے کے پیچ و خم کو، ہر ایک نے اپنے فکری، تاریخی اور واقعاتی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔"[۲۰]

پاکستانی لکھاریوں نے اس سانحہ پر کھل کر لکھا اور عالمی سیاست، دہشت گردی اور مذہب کو بنیاد بنا کر فرقہ وارانہ واقعات کو موضوع بنایا۔ ناول کی نسبت اردو افسانہ نگاروں نے نائن الیون کے بعد کی سماجی و سیاسی صورتحال پر زیادہ لکھا۔ کیونکہ جو بھی واقعات رونما ہوتے ہیں وہ اپنے اثرات اس دور کے ادیبوں پر بھی ڈالتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

"یہاں اس بات پر بحث کرنا مقصود نہیں کہ یہ رویہ کس حد تک جائز اور یکطرفہ ہے۔ یہاں صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جب بھی ملک سیاست یا معاشرتی زندگی کے افق پر کوئی قابل ذکر واقعہ رونما ہوا، اُردو ادیبوں نے اپنی تخلیق کا موضوع ضرور بنایا ہے"[۲۱]

یوں تمام تر صورتحال سے ایک فرد اپنے سماج، اپنے وطن میں خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگا جس سے خوف وہراس اور بے یقینی کی فضا پیدا ہو گئی۔ یوں اکیسویں صدی کا ہر فرد پچھلی صدی کا تجزیہ موجودہ حالات سے کرنے لگا موجودہ صدی نے پر سکون انسانی زندگی کو بے چینی اور عدم تحفظ میں مبتلا کر دیا۔

۴۔ انسانی رشتوں میں دوری

اکیسویں صدی میں پوری دنیا گلوبل ویلج بن گئی جدید ایجادات نے ٹرانسپورٹ کے میدان میں بھی ترقی کی منازل طے کر کے سفر کو آسان بنا دیا۔ جس کی وجہ سے دور دراز علاقوں میں بسنے والے اپنے عزیز و اقارب سے ملنے بہ سہولت اور بآسانی پہنچ سکتے ہیں۔ ذرائع نقل و حمل کی بدولت فاصلے طے کرنا آسان ہو گیا لیکن ان ایجادات کی بدولت جس مشینی دور میں انسانوں کا گزر بسر ہو رہا ہے۔ ان مشینوں ہی کی بدولت انسان بذاتِ خود ایک مشین بن کر رہ گیا ہے۔ اس ترقی یافتہ دور میں انسان مادیت پرست ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے نفسا نفسی بڑھ چکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اس تمام تر صورت حال میں انسانی احساسات اور جذبات میں کمی پیدا ہو گئی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ لوگ تعلقات اور رشتوں کو ایک بوجھ سمجھنے لگے ہیں۔ موجودہ دور کے انسان نے یوں تو بہت سی ترقی کی منازل طے کر کے اپنی زندگی کو آسانیوں سے ہمکنار کر لیا ہے اور جدت پسندی میں اس قدر سفر طے کر لیا کہ اب واپسی ناممکن معلوم ہوتی ہے۔ گذشتہ دو دہائیوں کا جائزہ لیں تو رشتوں میں اپنائیت اور خلوص پہلے زیادہ تھا لیکن ٹیکنالوجی نے ایک طرف تو انسان کو جتنی آسانیاں فراہم کیں ہیں تو دوسری طرف اسے کم وقت میں زیادہ کام انجام دینے کی طرف راغب کر دیا ہے۔ دور حاضر میں موبائل فون ایک ایسی ایجاد ہے جو ہر شخص کے پاس دستیاب ہے۔ جہاں ٹیکنالوجی کی اس ایجاد نے دور دراز رہنے والوں کو چند لمحوں میں اپنے رشتوں سے جوڑنے کا فریضہ انجام دیا تو دوسری طرف اپنوں سے دوری کی سب سے اہم وجہ موبائل فون ہی ہے۔ ایک فرد موبائل فون پر دور رہنے والے دوست احباب سے تو گفتگو کر رہا ہوتا ہے لیکن اپنے قریب موجود رشتوں کو نظر انداز کر رہا ہوتا ہے۔ رضوان طاہر مبین لکھتے ہیں:

> "تیز رفتار مشینی زندگی نے جہاں لطیف انسانی جذبات کا خون کیا ہے، وہیں خونی رشتوں کو بھی ضرورتوں اور غرض کا محتاج بنا دیا ہے چوں کہ اب ہمارے وقت کا اکثر حصہ مختلف ضروریات کی تکمیل کے لیے صرف ہوتا ہے لہٰذا اہم رشتہ داروں اور قرابت داروں سے بھی اپنے تعلقات کو اس ہی نظر سے دیکھتے ہیں اور اگر کسی سے ملتے ہیں تو فقط اپنے مقاصد

اور مفادات کے حصول کی توقعات لے کر، بہ صورت دیگر کنارہ کشی اختیار کر لی جاتی ہے۔"[۲۲]

دور حاضر کی نفسا نفسی اور خود غرضیوں نے انسانی زندگیوں کو خود اپنی ذات تک محدود کر دیا ہے۔ جس سے رشتوں میں جھجھک اور بناوٹ کا عنصر پروان چڑھتا ہے یہی بناوٹ بہت سے مسائل کی وجہ بنتی ہے۔ رشتوں سے دوری ہی موجودہ دور میں پریشانی اور نفسیاتی الجھنوں کا سبب دکھائی دیتی ہے۔ اسی لیے دور حاضر میں فرد تنہائی پسند ہو گیا ہے اور یہی تنہائی اسے تنہا نہیں چھوڑتی بلکہ اسے ماضی کی حسین وادیوں میں سیر کروانے لے جاتی ہے۔

رشتوں میں دوری کا احساس ہمیں ہجرت کے بعد بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس نقل مکانی کے نتیجے میں بہت سے خاندانوں کو تقسیم ہونا پڑا۔ کچھ لوگوں نے ہجرت کو اپنا نصب العین سمجھا تو کچھ لوگوں نے اپنے آبائی علاقے میں رہنے کو ترجیح دی۔ یوں ہجرت کے بعد درپیش مسائل کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ انسانی رشتوں سے دوری اور انہدام و پامالی کا مسئلہ سامنے آیا۔ مادیت پرستوں کے دور میں فرد کے تصورات و نظریات میں تبدیلی رونما ہوئی۔ مہاجرین جب ہجرت کر کے یہاں آئے تو اپنے ساتھ خوابوں کی وادیوں کو بھی لائے لیکن یہاں پہنچ کر ان کے خوابوں کو کچل ڈالا گیا۔ ایسی صورت میں فرد اپنے خوابوں کی دنیا میں زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے اور اسی طرح وہ ماضی کی یادوں میں پناہ لیتا رہتا ہے۔

۵۔ معاشرتی و تہذیبی ورثے سے دوری

تہذیب و ثقافت کسی قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ تہذیب و ثقافت ہی کی بدولت ایک قوم دوسری قوم سے منفرد اور الگ پہچان رکھتی ہے اور ہر قوم اپنی تہذیب و تمدن کی حفاظت اور بقا کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ جو قومیں اپنی نسل نو کی تربیت اپنے اجداد کے تاریخی ورثے کے زیر سایہ کرتیں ہیں وہ مہذب اور زندہ جاوید اقوام کہلاتی ہیں۔ دور حاضر نہت نئی سائنسی ایجادات اور اختراعات کا جدید دور ہے۔ اس دور میں کھانے، پینے کی اشیا کے ساتھ ساتھ لباس میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ دور جدید میں ہم نے اپنی طرز زندگی کو ترک کر کے مغربی اقوام کی متعین کردہ طرزِ زندگی کو اپنانا شروع کر دیا۔ دیکھا جائے تو جدت پسندی اور روشن خیالی کے

نام پر دیگر اقوام کی تہذیب و ثقافت اور اخلاقی اقدار سے نا آشنا اور دور کر دیا ہے۔ موجودہ دور میں نوجوان طبقہ تذبذب کا شکار نظر آتا ہے۔ یہ نوجوان نسل اپنے اجداد کے ساتھ وقت گزارنے کے بجائے اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ انٹرنیٹ اور موبائل فون کے استعمال میں صرف کر دیتی ہے۔ تہذیب سے دوری کے سبب معاشرے میں عدم برداشت اور ادب واحترام کا فقدان پیدا ہو گیا ہے۔ قیام پاکستان کے نتیجے میں صدیوں پر مشتمل تہذیبی ورثہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔ مہاجرین کے لیے یہاں کی فضا میں اجنبیت اور لاحاصل کا احساس کرب کا باعث بنا رہا تھا۔ یہی کرب اجنبیت اور بے وطنیت کا احساس پیدا کرنے میں پیش پیش رہا۔ اس طرح ایک نئی تہذیب سے تعلق قائم نہ ہو سکا جس کی بنا پر فرد داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر متاثر ہوا۔ وہ نئی تہذیب بھی اس کو اجنبیت کا احساس دلاتی رہی اور وہ اپنے گزرے ہوئے دنوں کو بھول نہ سکا تو وہ ناسٹلجیا میں مبتلا ہو گیا۔ اس ضمن میں وزیر آغا لکھتے ہیں:

> "برصغیر کا باسی جو صدیوں کے تہذیبی عمل کی پیداوار تھا۔ فسادات میں ابھرنے والی بربریت کے ہاتھوں دونیم ہو گیا تھا۔ فسادات نے نہ صرف جسمانی سطح پر انسان کی قطع و برید کی تھی بلکہ اس کی شخصیت کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔"[۲۳]

دور جدید میں خاندانی نظام میں بھی بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں پہلے سب لوگ مشترکہ خاندانی نظام کے تحت ایک ہی گھر میں رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن دور حاضر شخصی آزادی کا دور ہے اس لیے مشترکہ خاندانی نظام سے فرار اور بغاوت کا رویہ پروان چڑھا۔ خاندانی تبدیلیوں کے سبب رسم و رواج بھی اپنی وقعت کھو رہے ہیں۔ یوں دور جدید میں پرانے سماجی ڈھانچے میں ہونے والی شکست وریخت کے ساتھ ساتھ ایک نیا سماجی ڈھانچہ تشکیل نو کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ یوں ہونے والی ان تمام تبدیلیوں کے نتیجے میں انسان جدید چیزوں کو فراغ دلی سے قبول تو کرلیتا ہے لیکن وہ قدیم دور کی طرز زندگی کو بھی فراموش نہیں کر پاتا۔ اکثر و بیشتر وہ اپنے ماضی کو یاد کرتا رہتا ہے۔ گزرے ہوئے دنوں کی یادوں کو بھلا پانا بہت مشکل کام ہے۔ دور جدید میں فرد کو شخصی آزادی حاصل ہے لیکن اس آزادی کے باوجود وہ تنہائی پسند ہو گیا ہے۔ اس کے بنیادی وجہ اس فرد کے گرد و نواع کا ناساز گار ماحول ہے تو وہ اسی ماحول کی ناسازی سے فراریت کے لئے ماضی کی جانب رخ کرتا ہے جو اس فرد کو ناسٹلجی بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

۶۔ بے یقینی، لاتعلقی اور خوف کا احساس

اکیسویں صدی کے اوائل میں ہی امریکہ میں موجود جڑواں ٹاورز پر حملوں کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرا کر افغانستان اور عراق کو اپنے قہر کا نشانہ بنایا گیا۔ اس تباہی نے عالمی سیاسی منظر نامے کو بدل کر رکھ دیا۔ مسلم ممالک میں سب سے زیادہ نقصان پاکستان کو اٹھانا پڑا جہاں آئے روز ہونے والے خود کش حملوں اور امریکا ڈرون حملوں نے پورے ملک میں خوف اور جنگ وجدل کی فضا قائم کر رکھی تھی۔ اس دہشت گردی کے نتیجے میں بے شمار قیمتی انسانی جانوں کا ضیاع ہوا۔ اس قسم کے حالات نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ لوگ نہ عبادت گاہوں میں محفوظ تھے اور نہ ہی تفریحی مقامات اور بازاروں میں محفوظ تھے۔ جو لوگ حصول معاش کے لئے گھروں سے نکلتے تو وہ اس کشمکش میں مبتلا رہتے کہ نہ جانے کس لمحے انھیں دہشت گردی کے حملوں کی نظر نہ ہونا پڑ جائے۔ ہر طرف خوف، بے یقینی کے احساس نے ہر شخص کو مایوسی میں مبتلا کر دیا تھا۔ ہر شخص دوسرے شخص کو مشکوک نظروں سے دیکھتا گویا اپنے ارد گرد موجود ہر شخص ہی دہشت گرد معلوم ہوتا۔

اس دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نتیجے میں نہ صرف پاکستان کو جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا بلکہ ملکی معیشت کو بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ان تمام تر نقصانات کے علاوہ جو سب سے بڑا نقصان ہوا وہ خوف لوگوں کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا اس نے لوگوں کی سوچ، ان کی فکر کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ یوں اس ایک نائن الیون کے واقعہ نے پوری دنیا کے منظر نامے کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس صدی میں لوگوں کو عدم تحفظ کا احساس، تنہائی اور خوف نے اپنے شکنجے میں لے لیا۔

یہ تو اس صدی کی پہلی دہائی کا منظر نامہ ہے جو اب تک اپنے اثرات سے متاثر کر رہا ہے اور اس صدی کی دوسری دہائی میں ایک اہم واقعہ اس وبائی مرض کرونا کو مانا گیا جس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور لاکھوں انسانی جانوں کو لقمہ اجل بننا پڑا۔ اس وبا نے جہاں سماجی فاصلوں کو فروغ دیا تو فرد کو تنہائی، بے یقینی اور خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا۔

۷۔ تشخص کی تلاش

انسان آغاز زندگی سے ہی اپنی ذات کی تلاش کے حوالے سے تجسس کا شکار رہا ہے۔ اس شخص کے لیے زندگی گزارنا بہت مشکل ہو جاتا ہے جو اپنی شناخت سے آگاہی حاصل نہ کر پائے۔ تشخص کو تلاش کرنے کا عمل اس وقت بہت شدت اختیار کر گیا جب قیام پاکستان کے نتیجے میں لوگوں کو ہجرت کا کرب برداشت کر کے دوسرے خطے میں آ کر آباد ہونا پڑا۔ یہاں کی تہذیب سے اجنبیت کے احساس نے انھیں اپنی شناخت سے محروم کر دیا جس کے سبب ایک شخصی بکھراؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ جب چیزوں کو یا اشخاص کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جائے تو یہ عمل ان کو ذات کی تلاش کا احساس اجاگر کرتا ہے۔ چاہے اس نئے وطن میں مہاجرین کو گھر، زندگی کی بنیادی ضروریات کا سامان مل بھی گیا تھا تو پھر بھی انھیں اپنی گمشدہ پہچان اور اپنی شناخت کی تلاش اور جستجو باقی رہی تھی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

> "پہچان کی گمشدگی کی دوسری صورت قیام پاکستان کے بعد خصوصی حالات کی وجہ سے نمایاں ہوئی ۔۔۔۔ قوم پہلے سے موجود تہذیبی دھارے سے کٹ چکی تھی۔ اب نئی تہذیب کی پرورش کی ضرورت تھی لیکن حالات سازگار نہیں تھے اور سمت کا تعین بھی نہ تھا۔۔۔۔ پہچان کی گمشدگی نے اسی بھیڑ میں جنم لیا۔۔۔۔ یہ تصویریں ذات کی گمشدگی کا اعلان نامہ بھی ہیں اور تہذیب و روایات اور اخلاق و اقدار کے کھو جانے اور بے توقیر ہو جانے کا نوحہ بھی۔"[۲۴]

جدید دور میں قدیم معاشرتی روایات اور اقدار میں جدت اور آزاد خیالی کے نام پر جب تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوئیں تو سماجی معیارات بھی تبدیل ہو گئے۔ ان معیارات نے پوری دنیا میں موجود انسانوں کے معیارات کو بھی تیزی سے بدل کر رکھ دیا۔ اب ظاہری شان و شوکت کی بنیاد پر انسانوں کو پرکھا جاتا ہے۔ یوں فرد کی شناخت اس کی ذات کی بجائے اس کی مادی ترقی کی بنا پر ہونے لگی ہے۔ اس طرح فرد کی شناخت ظاہری رنگینیوں میں گم ہو گئی ہے۔ جب سے دور جدید میں پیسوں اور مادی آسائشوں کو اہمیت ملی ہے تو دیہی علاقوں سے کثیر تعداد میں لوگوں نے حصول معاش کی غرض سے شہروں کا رخ کیا کیونکہ شہروں میں روزگار کے

مواقع دیہاتوں کی نسبت زیادہ ہیں۔ اس مشینی تیز رفتار دور میں فرد بھی ایک مشین بن کر رہ گیا ہے۔ ان مشینوں سے پہلے چاہے انسانوں کو زیادہ محنت کرنا پڑتی تھی لیکن اس کے پاس اس خاندان والوں کے لیے وقت ہوتا تھا لیکن ان مشینوں نے جہاں انسانوں کو آسانیوں سے ہمکنار کیا ہے وہیں ان سے کم وقت میں زیادہ کام بھی لیا جاتا ہے۔ اس طرح کسی کے پاس وقت ہی نہیں جو دوسروں کے پاس بیٹھ کر حال واحوال ہی پوچھ سکیں۔ یوں اس دور میں انسان انسانوں سے دور ہو رہے ہیں اور تشخص کا بحران فروغ پا رہا ہے۔ لوگوں کے ہجوم میں بھی فرد خود کو تنہا محسوس کرتا ہے اتنے لوگوں میں اسے کوئی چہرہ بھی آشنا معلوم نہیں ہوتا۔ اس طرح اپنی شناخت کے کھو جانے پر وہ تنہا اور اجنبی ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر شفیق انجم رقمطراز ہیں:

> "گمشدگی کی تیسری صورت عالمی۔۔۔ صنعتی و سائنسی ترقی اور مشینوں کے آجانے سے سہولیات تو بہم پہنچیں لیکن اس عمل نے انسانی جذبوں اور قدروں کو بے توقیر کر دیا۔ مشینی ماحول نے فرد کی انانیت اور اس کی تخلیقی وجمالیاتی اپج پر قدغن لگا دی ۔۔۔ روایات واقدار کی ٹوٹ پھوٹ اور معاشرتی زندگی کی شکست وریخت میں افراد بے چہرہ ہو گئے، شناخت مسخ ہو گئی اور ایک بڑی سطح پر گمشدگی کے المیے نے جنم لیا۔"[۲۵]

یوں دور جدید کے لکھاریوں نے تنہائی، تشخص کی تلاش، ذات کا کرب، بے معنویت اور عدم شناخت جیسے موضوعات کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ پھر فرد کی معاشرے میں شناخت کے حوالے سے سوالات اٹھائے گئے کہ لوگوں کے ہجوم میں ہوتے ہوئے ایک فرد کس طرح عدم شناخت کا حامل ہوتا ہے۔ اس طرح فرد کا اپنی شناخت اور تشخص کی تلاش کا عمل ہی اس کی ذات سے شروع ہو کر اجتماع تک پہنچ جاتا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ صدی میں سائنسی ایجادات اور اختراعات کی بدولت ترقی جو بام عروج پر ہے اس ترقی نے تہذیبی و ثقافتی قدروں کو پامال کر کے انسانی جذبات واحساسات کو پاش پاش کر کے شخصیتوں کو بکھراؤ کا شکار کر دیا۔ یہ بکھراؤ ہی عدم شناخت کا موجب بنا ہے۔

اس طرح یہ تمام محرکات وعوامل ناسٹلجیا کے جنم لینے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ناول اور افسانوں میں زندگی کے حقائق کو مختلف کرداروں کی مدد سے پیش کیا جاتا ہے۔ ایک ادیب کرداروں کی نفسیات، ان کے عمل وحرکات کا انحصار کہانی کے موضوع پر ہوتا ہے۔ ایک ادیب کرداروں کی نفسیات کے

ذریعے ہی عصری صورتحال اور اس کی تلخی، انسانی رشتوں اور تہذیبی ورثے سے دوری اور تشخص کی بازیافت جیسے عناصر کو پیش کرتا ہے۔ بسا اوقات ان کرداروں کو حال سے فرار دے کر ماضی کے دریچوں میں پناہ بھی دیتا ہے اور کبھی حال کی تلخیوں کو بھی ان کی مدد سے پیش کرتا ہے۔ جو کردار ماضی کو پیش کرتے ہیں انھیں ناسٹلجی کردار کہا جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ آن لائن انگلش ٹواردوڈکشنری ۲فروری08:00PM

www.dictionaryenglishtourdu.com

2۔ Advanced Practical Dictionary (English to English and Urdu) with brief general knowledge, Azhar publisher Lahore, Pakistan page 852

۳۔ آن لائن آکسفورڈ انگلش ڈکشنری،۱۲مارچ۲۰۲۱ء،04:00PM

en.oxforddictionaries.com

۴۔ آن لائن کیمبرج ڈکشنری یوکے / یو ایس اے ۲اپریل۲۰۲۱ء،05:00 PM

www.dictionary.cambridge.org

5۔ David B. Gura, websters, New word Dictionary of the American language, David B. Guralnifon ,the word publishing company New York and Cleveland, page 973

۶۔ محمد عاصم بٹ، عبداللہ شخصیت اور فن ،ص ۵۸

۷۔ احمد سہیل، تنقیدی تحریریں , اردو افسانے کا ناسٹلجیا، قلم پبلی کیشنز، ممبئی، ۲۰۰٤ء، ص ۳۲، ۳۳

۸۔ آن لائن انسائکلو پیڈیا ۲۰مئی ۲۰۲۲ء،03:00PM

www.encyclopedia.com

۹۔ آن لائین انسائکلو پیڈیا

www.encyclopedia.com

۱۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں(ابتدائی دور سے 1957ء تک)،ص103

۱۱۔ آن لائن میڈیکل ڈکشنری

www.medicalnewsday.co

۱۲۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردوافسانہ(بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں)، پورب اکادمی، اسلام آباد2008ءص190

۱۴۔ محمد عالم خان، ڈاکٹر، اردو افسانے میں رومانی رجحانات، علم و عرفان پبلشرز، لاہور،ص431

۱۴۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ (بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں) پورب اکادمی، اسلام آباد،2008ء،ص195

۱۵۔ انواراحمد،ڈاکٹر،اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد2007ء،ص26

۱۶۔ ایضاً،ص31

۱۷۔ محمد ساجد،۹/۱۱کے اردو افسانے پر اثرات،ندائے گل پبلی کیشنز،لاہور،س ن،ص35

۱۸۔ مجاہدکامران، ڈاکٹر،پس پردہ: عالمی سیاست کے مخفی حقائق،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،2011ءص21

۱۹۔ مجاہدکامران، ڈاکٹر،۹/۱۱ The new word order سانحہ ستمبر اور نیاعالمی نظام، مترجم: ظفر المحسن پیرزادہ،یونیورسٹی آف دی پنجاب،لاہور،2014ءص4

۲۰۔ نجیبہ عارف، ۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ، پورب اکادمی، اسلام آباد،2001ء،ص12، 11

۲۱۔ ایضاً، ص22، 21

۲۲۔ رضوان طاہر مبین، کیوں دور ہیں اپنے؟

http.www.express.pk./

story80384

۲۳۔ گوپی چند نارنگ(مرتب) ، اردو افسانہ روایت ومسائل، سنگ میل پبلی کیشنز،
لاہور،2002ءص 507

۲۴۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ(بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں)،
پورب اکادمی، اسلام آباد، 2007ء، ص252

۲۵۔ ایضاً، ص238

باب دوم

انتظار حسین کے افسانوں میں ناسٹلجیائی رجحان کا مطالعہ

الف: یادِ ماضی اور ہجرت کے تناظر میں

انتظار حسین کے افسانوں میں کرداری ناسٹلجیا پر بات کرنے سے قبل ان کے مختصر حالات زندگی کو بیان کرنا ضروری ہے کیونکہ ان کی زندگی کے واقعات نے ان کی تحریروں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ انتظار حسین یو پی میں ۳ دسمبر ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ جب بر صغیر پاک وہند کی تقسیم کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ ہجرت کر کے لاہور آ گئے۔ یوں تو یہ ہجرت ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر سکونت اختیار کر لینے کا نام ہے لیکن اس نئی جگہ نے ہر لمحہ آنے والوں کو اجنبیت کا احساس دلائے رکھا۔ جس کے سبب مہاجرین اپنی پرانی تہذیب، اپنی بستی، اپنی گلیوں کو یاد کرنے لگے۔ ماضی ایک ایسا زمانہ ہے جو گزرے ہوئے لمحات کو چاہیے وہ اچھے ہوں یا برے ان کو حال میں خوبصورت احساس کے طور پر دکھاتا ہے۔ انتظار حسین کا شمار ایسے ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے آپ کو، اور اپنی بستی کو ماضی کی یادوں کے ذریعے کھوجا تھا۔ جو لوگ ہجرت کر کے آئے تھے ان کے ہاں ناسٹلجیا کا جنم لینا ایک فطری عمل کے طور پر سامنے آتا ہے۔ انتظار حسین کے افسانوں کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش لکھتے ہیں:

> "انتظار حسین کے افسانوں کے کردار اخلاقی اقدار اور سماجی روایات کی ٹوٹ پھوٹ کو اجاگر کرتے ہیں، علاوہ ازیں وہ اپنے ماضی کی بھٹکی ہوئی روح سے رابطہ قائم کرنے کے آرزو مند بھی ہیں تاکہ پوری روایت اور حقیقت کا شعور حاصل کر سکیں۔۔۔ کہانی کے کردار خود اپنی تلاش میں سرگرداں ہیں، یعنی اپنے وجود کے کٹے حصے کو ماضی میں کھوج رہے ہیں۔۔"[1]

اردو افسانے میں انتظار حسین کا شمار نامور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے ادبی سفر کے آغاز کا جائزہ لیں تو انہوں نے ہجرت کے بعد لکھنا شروع کیا۔ ان کا پہلا افسانہ "قیوما کی دکان" ۱۹۴۸ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ انتظار حسین کے افسانوں میں ناسٹلجیائی فضا چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اردو افسانے میں ناسٹلجیا کے عناصر پر بات کی جائے تو ہمیں قرۃ العین اور انتظار حسین کے نام اردو افسانے میں ناسٹلجیا کے حوالے سے

نمایاں نظر آتے ہیں۔ جو اپنے افسانوں میں ناسٹلجیائی کرداروں کے ذریعے ناسٹلجیا کی پیشکش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔اس حوالے سے شیخ محمد غیاث الدین لکھتے ہیں:

"انتظار حسین کا نام جب بھی سامنے آتا ہے ذہن اپنے آپ ماضی کی یادوں میں کھو جاتا ہے۔ داستان، عہد نامے، انجیل، قصص الانبیاء۔۔۔ کی ایک نئی دنیا تازہ ہو جاتی ہے۔ انتظار حسین کے افسانوں کے خاص موضوعات تقسیم ہند، فسادات، ہجرت، خواب ہند اسلامی کلچر، تاریخ واقعہ کربلا، غدر ۵۷، سقوط ڈھاکہ اور ہند پاک جنگ۔۔۔ انہیں اپنی مٹی سے بچھڑنے کا بڑا افسوس ہے۔ یہ غم ان کی نگاہ میں دنیا کے ہر بڑے حادثے سے عظیم ہے۔۔۔ ان کی یادیں ہجرت کرنے والوں کو کبھی بھول نہیں پائیں گی"[۲]

اردو ادب میں انتظار حسین کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے فن افسانہ نگاری میں استعاراتی اور علامتی اسلوب کے نئے تجربات کرکے ان کو منفرد انداز میں برتا ہے۔ ان کی تحریروں میں ہمیں ماضی پرستی، ماضی کی یادوں کے ذریعے پرانی روایت کی تلاش نظر آتی ہے۔ انتظار حسین ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت تھے۔ انھوں نے ناولوں، افسانوں کے ساتھ ساتھ تذکروں، کالموں، بچوں کی کہانیوں، تراجم نیز تنقیدی تحریروں میں بھی اپنی ادبی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ ان کا پہلا افسانہ "قیوما کی دکان جو "ادب لطیف" میں ۱۹۴۸ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "گلی کوچے "۱۹۵۲ میں منظر عام پر آیا تھا۔ انتظار حسین اپنے افسانوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"میں کہانی کیا لکھتا ہوں، کھوئے ہوؤں کی جستجو کرتا ہوں اور آتش رفتہ کا سراغ لیتا پھرتا ہوں لیکن آتش رفتہ کے سراغ کا سلسلہ شروع ہو جائے تو بات سن ستاون تک محدود تو نہیں رہ سکتی، پہنچنے والا کربلا تک بھی پہنچ سکتا ہے اور اس سے پیچھے جنگ بدر تک بھی جا سکتا ہے"[۳]

انتظار حسین اردو کے ایک ایسے فکشن نگار ہیں جو اپنی کہانیوں کے لئے مواد اپنی تہذیب اور ماضی سے حاصل کرتے ہیں۔ ان کی فکشن کی اس خصوصیت پر ان کے ناقدین نے بہت سے اعتراضات کیے۔ دانتے کے بقول انسان کی بنیادی خواہش خود اپنے ہی تصور کو آشکار کرنا ہوتی ہے۔ جب ہم انتظار حسین کے فکشن کے موضوعات، استعاروں، علامتوں، بیانیہ کے طریقے کار کو دیکھتے ہیں تو جو چیز سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ:

۱۔ناسٹلجیا

۲۔حال سے فرار اور ماضی میں جائے پناہ کی تلاش

۳۔داستانی انداز تحریر

۴۔بے تعلقی کی فضا

۵۔انسان کی جانوروں کے روپ میں کایا کلپ

انتظار حسین کے افسانے ماضی اور ہجرت کے بیان میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔انہوں نے نہ صرف ہجرت کی سختیوں کو بذات خود برداشت کیا بلکہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی تناؤ کو بھی محسوس کیا۔انہوں نے افسانہ نگاری کا آغاز ہجرت کے بعد کیا تھا۔اسی لیے انہوں نے اپنے افسانوں میں ہجرت،فسادات کے واقعات اور تہذیبوں کے بکھراؤ کو بیان کیا ہے۔جو لوگ ہجرت کر کے آئے انھیں اپنا سب کچھ گھر بار، رشتے ناطے سبھی کچھ پیچھے چھوڑ کر ایک اجنبی ملک میں آ کر آباد ہونا پڑا۔ یہاں کی ہر چیز اجنبیت کا اظہار کر رہی تھی۔ایسی صورت حال میں ان لوگوں کا اپنے خارج سے زیادہ داخل کی طرف رجحان گہرا ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنے ماضی کے کٹے ہوئے حصے کو کبھی بھی فراموش نہ کر سکے بلکہ اس کٹے حصے کی بازیافت وہ اپنے تخیل کے پیرائے میں کرتے رہے۔

انتظار حسین بذات خود ہجرت کر کے آئے تھے۔ اس ہجرت کے تجربے نے ان کی تحریروں میں ناسٹلجیا کی پیش کش میں اہم کردار ادا کیا۔ہجرت سے پہلے وہ جن ہستیوں کو اپنے علاقے میں دیکھ کر یہ سوچا کرتے تھے کہ یہ کبھی بھی اپنے علاقے کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے بلکہ یہ ایک مضبوط درخت کی مانند اپنی جڑیں اس تہذیب میں پیوست کر چکے ہیں لیکن ہجرت کے موقع پر انہوں نے ان ہستیوں کو نہ صرف اپنے علاقوں کو چھوڑتے دیکھا بلکہ انہیں تیتر بتر، بے سروسامانی کے عالم میں بھی دیکھا۔۱۹۴۷ کی ہجرت اور پھر ۱۹۷۱ میں ملک کا دو ٹکڑے ہو جانے کے عمل نے ایک بے گھری اور تہذیبی بکھراؤ کی صورتحال کو جنم دیا تھا۔ اسی صورتحال نے فرد کو اداسی، تنہائی اور افسردگی سے دوچار کیا۔ یہ تمام اجزا بھی ناسٹلجیا کے اجزائے ترکیبی کا حصہ ہیں۔

انتظار حسین کی شخصیت بھی ہمیں ناسٹلجیائی کردار کے طور پر ہی دکھائی دیتی ہے۔انھیں ماضی کے واقعات کو یاد رکھنے کا گر آتا تھا۔وہ تاریخی واقعات کو اپنی زندگی کے واقعات سے جوڑ کر یاد کرتے تھے۔اسی طرح کے ناسٹلجیائی کردار ان کی کہانیوں میں جابجا نظر آتے ہیں کیونکہ ان کی کہانیوں میں ہجرت

اور اس سے پیدا ہونے والی صورتحال اور احساسات و جذبات کا بیان ہے۔ انتظار حسین نے سہیل احمد کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا:

> "میرے یہاں کوئی رویہ پیدا ہوا تو یہ کسی کتاب کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک واردات کے حوالے سے ہوا۔ ابھی میں ان لوگوں کو پڑھ ۔۔۔۔ مجھے ہجرت کرنی پڑی ۔۔۔۔ اس ہجرت کے عمل میں، میں نے جس حال میں لوگوں کو دیکھا وہ ایک نیا تجربہ تھا۔ میں نے ان لوگوں کو دیکھا جنہیں میں پہلے اور عالم میں دیکھ چکا تھا ۔۔۔۔ پھر انہی بزرگوں، انہی شخصیتوں کو جو اس روایت کا حصہ تھے ۔۔۔۔ یہ سارا عمل جو میں نے دیکھا تو شاید اس وجہ سے جب میں نے افسانے لکھنے شروع کیے تو اپنے طور پر میرے یہاں کچھ دوسرے رویے پیدا ہو گئے ہوں "[۴]

انتظار حسین کی تحریروں میں ہجرت اور ماضی کی یادوں کا بیان بہت زیادہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ ایک ادیب تحریر لکھتے ہوئے اپنے حالات اور واقعات کو فراموش نہیں کرتا بلکہ ان کا اظہار کسی نہ کسی طور پر اپنی تحریروں میں کرتا ہے۔ انتظار حسین کی تحریروں میں ہجرت اور ماضی کی یادوں کا اظہار ناسٹلجیا کے طور پر ملتا ہے۔ ان کی تحریروں میں ادیب کا ناسٹلجیا اور کرداری ناسٹلجیا دونوں کارفرما ہیں۔ انتظار حسین نے بچپن ہی سے اس وقت ہجرت کر کے کرب کو محسوس کر لیا تھا جب وہ اپنے آبائی گھر سے شہر میں منتقل ہوئے تھے۔ پھر اسی وقت قیام پاکستان کے نتیجے میں ہجرت کر کے اپنی بستی، اپنا گھربار اور اپنی تہذیب سب ہی کچھ چھوڑنی پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے ذہن کو یادوں سے آزاد نہیں ہونے دیا اور انہی یادوں اور اپنی بستی کو چھوڑنے کی اذیت ناک صورتحال کو اپنے افسانوں میں بیان کیا۔ ہجرت کے بعد بظاہر ایک نئے دور نے جنم لیا تھا لیکن ذہن اس نئے دور کو تسلیم کرنے کے بجائے پرانے زمانے کی یادوں میں گم تھا۔ ہجرت کا تجربہ ہر شخص کے لیے مختلف تھا اس لیے ہر ایک نے اس کی اذیت کو مختلف انداز میں محسوس کیا۔ ہجرت بذات خود تو خارج میں رونما ہونے والا عمل ہے لیکن اس کے نتیجے میں باطنی دکھ درد کا احساس طویل عرصے تک لوگوں کے ساتھ رہا بلکہ اس دکھ درد نے ان لوگوں کو بھی آگے نہ بڑھنے دیا بلکہ ان کو ماضی کی یادوں میں محور کھا۔ انتظار حسین نے ہجرت کے حوالے سے لکھا:

> "اس وقت ہم سب پاکستانی مہاجر تھے، غیر مقامی بھی اور مقامی بھی۔ اس لیے کہ سوال اصل میں ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں نقل وطن کا نہیں بلکہ پرانے ملک سے

نئے ملک میں ہجرت کا تھا۔ کچھ لوگ سپیشل گاڑیوں میں بیٹھ کر پاکستان پہنچے، کچھ لوگوں نے یہیں بیٹھے بیٹھے اپنے آپ کو پرانے ملک سے نئے ملک میں داخل ہوتے دیکھا۔ ان ک پیروں کے نیچے کی زمین جو پہلے ہندوستان تھی اب پاکستان بن گئی تھی۔ ذہنی ہجرت کا سوال دونوں قسم کے مہاجروں کے ساتھ تھا۔" [۵]

ہجرت کی واردات کو سب لکھنے والوں نے مختلف انداز میں بیان کیا۔ ان لکھاریوں نے اپنی پرانی بستی، گلی کوچے کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کو ہمدردانہ انداز میں بیان کیا۔ ہجرت سے پہلے ماضی کے بیان کو اتنی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ لیکن ہجرت اور فسادات کے واقعات کے بعد یہ رویہ ادیبوں کے یہاں زیادہ دکھائی دینے لگا۔ اسی عمل کو ناسٹلجیا کہا جاتا ہے۔ جب ایک ادیب اپنے ماضی میں پیچھے رہ جانے والی چیزوں اور جو کچھ وہ کھو چکا ہے اس کو از سر نو حاصل کرنے کی خواہش سر اٹھانے لگتی ہے۔ انتظار حسین فرد و سماج، حیات اور کائنات اور وجود کی نوعیت و ماہیت کے مسائل کو منطقی رویہ سے جانچتے ہوئے شعور، تحت الشعور اور الشعور کی سیماؤں کو مالدیتے ہیں۔ وہ انسان کے باطن میں سفر کرتے ہوئے جدید عہد کے انسان کی افسردگی اور کشمکش کو منظر عام پر النے کی کوشش کرتے ہیں۔ شکست و ریخت اور جنگل، اجنبی پرندے، خالی گھر، وہ جو دیوار، تلاش و جستجو انتظار حسین کے فکشن میں کثرت سے ملتی ہے۔

ہمیں انتظار حسین کے افسانوں میں ناسٹلجیا کی پیشکش بہت شدت سے دکھائی دیتی ہے۔ "شہر زاد کے نام"، انتظار حسین کا یہ افسانوی مجموعہ ۲۰۰۲ میں سنگ میل سے شائع ہوا۔ یہ ان کے تخلیقی ادبی ارتقاء کا ایک اور منظر نامہ ہے۔ جس میں بدلتے ملکی حالات کا منظر نامہ اور انسان کی داخلی صورتحال بھی نظر آجاتی ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں سترہ افسانے شامل ہیں۔ جن میں تاریخ، بدلتے حالات، انسانی کیفیات و نفسیات، اساطیر گویا ان کے فن کی تمام تر خصوصیات موجود ہیں۔ جو ان کو باقی افسانوی منظر نامے میں سب سے منفرد کرتی ہیں۔

ہمیں انتظار حسین کی تحریروں میں ماضی کا اظہار بہت زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ ان کے کردار اکثر و بیشتر اپنے خیال سے فرار کے لئے ماضی کی آغوش میں پناہ لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہجرت کرنے کے بعد دوسرے شہر، دوسرے وطن میں آباد ہو جانے کے بعد بھی انتظار اپنی بستی کو اپنے دل و دماغ سے نہ نکال سکا۔ پہلے تو یہ بستی صرف دل و دماغ کا حصہ بنی ہوئی تھی پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس بستی کی یادیں مزید گہری ہوتی چلی گئی اور پھر یہ بستی انتظار کے خوابوں کا حصہ بن گئی۔ "دائرہ" اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے۔ جو

اپنی تکنیک کے اعتبار سے یادداشتیں ہیں۔ جہاں انتظار حسین دائرے کی صورت ماضی کے کھنڈرات میں سفر کرتے نظر آتے ہیں۔ کہانی میں سراپا نگاری اور مافوق الفطرت یاماورائے حقیقت واقعات نے داستانوی خوبی پیدا کر دی ہے۔ جو ان کا خاص رنگ ہے۔ مگر اس میں بھی تاریخ کے ہلکے پھلکے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ جو اس کی اہمیت کو بڑھاتے ہیں۔ شاعرانہ نثر سے خوب کام لیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ وصف ان کے ہاں کثرت سے دکھائی دیتا ہے۔ جس کے ساتھ ساتھ وہ محاوروں کا بھی بھرپور استعمال کرتے ہیں اگر ایک جملے میں ان کے اس افسانے کو سمیٹوں تو وہ یہ ہو گا "یہ کہانی انتظار حسین کی یاداشتوں کا ایسا مجموعہ ہے، جس میں ان کا ماضی سانس لیتا محسوس ہوتا ہے اور تاریخ ایسی کہ جس کو دیمک نے نہ چاٹا ہو۔ بلکہ محفوظ آثار قدیمہ میں بدل گئی ہو۔

وہ اپنے افسانے "دائرہ" میں اپنی بستی کو یاد کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں پر موجود لوگوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ وہ اپنے پہلے افسانے کے کردار قیوما کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ کردار افسانے کا مرکزی کردار تھا جسے لکھتے وقت انہوں نے زیلی کردار کے طور پر لکھ دیا تھا تو اس کردار کو دوبارہ پیش کرنے کے لیے افسانہ "دائرہ" لکھا۔ اس حوالے سے ایک اقتباس پیشِ نظر ہے:

> "قیوما تو اس کہانی کا مرکزی کردار نہیں تھا۔ وہ تو دوسرا شخص تھا۔ جانے اس وقت کہانی لکھتے ہوئے میں اسے کیسے بھول گیا۔ اب یاد آیا ہے پچاس برس بعد بلکہ اب تو اس تھڑے پہ بیٹھی ہوئی وہ پوری ٹولی، وہ سارے کردار زیادہ تفصیل سے یاد آ رہے ہیں۔"[٦]

انہوں نے اس کردار کو دوبارہ لکھنے کے ساتھ ساتھ اس بستی کی ہر چیز کو مزید وضاحت سے منظر کشی کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔ مصنف کے مطابق ایک بستی جغرافیائی نقشے پر آدھی موجود ہوئی ہے جبکہ آدھی ہر شخص کے دل و دماغ پر نقش ہوئی ہے۔ اس جغرافیائی بستی کو چھوڑ کر کسی اور خطے میں جا کر آباد ہو جایا بھی جائے تو جو بستی انسان کے ذہن پر نقش ہوئی ہے اس سے کسی طور پر چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔ اس افسانے میں مصنف وہاں پر موجود دکانوں کا احوال بھی بیان کرتا ہے کہ کس طرح وہ مہمانوں کی آمد پر پنساری کی دکان سے مختلف مصالحہ جات خریدتا تھا۔ اسی طرح قیوما کی دکان کے سامنے سے ہندوؤں کے جو جو جلوس گزرتے تھے وہ ان کو بھی وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ ان تمام جلوسوں کو بیان کرتے ہوئے اپنے گزرے وقت کو بھی یاد کرتا ہے کہ کس طرح اپنی بستی کی گلیوں میں گھوما پھرا کرتا تھا۔ ایک دن مصنف اپنے دوستوں کے ساتھ جا رہا تھا کہ ایک خوفناک واقعہ رونما ہوا کہ ایک عورت انہیں نظر آئی ایک دوست کہتا ہے کہ یہ عورت ہے تو دوسرا دوست کہتا ہے کہ وہ عورت نہیں ہے اس کے پاؤں دیکھو تو وہ جیسے ہی اس کی طرف دیکھتے ہیں تو وہ عورت

غائب ہو جاتی ہے۔ مصنف اور ان کے دوست خوف کے عالم میں وہاں سے بھاگتے ہیں۔ اسی طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مصنف اپنی بستی، وہاں کے لوگوں اور وہاں کی چیزوں کو شدت سے یاد کرتا رہتا ہے اور انہی سب کو اپنے خوابوں میں اکثر دیکھتا رہتا ہے۔ مصنف کو ہجرت کیے ہوئے پچاس برس ہو گئے پھر بھی وہ اپنی پرانی بستی کو اپنے دل و دماغ سے نکال نہ سکے یہی وجہ ہے کہ وہ اس بستی کو اپنے خوابوں میں بھی دیکھتے رہتے تھے۔اور اس بستی میں بسنے والوں کے احوال کو بھی مصنف نے اپنے خوابوں کے ذریعے سے جانا تھا۔

انتظار اپنے ایک افسانے "ہم نوالہ" میں چڑیا کو کھانا ڈالتے ہوئے ماضی کی یادوں میں گم ہو جاتے ہے۔ یہاں بھارتی راجھستانی موروں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ایک مختصر سے راجھستانی سفر نامے کا گمان ہو تا ہے۔ جے پور' پنک سٹی، وہاں کا حسن، وہاں کے مور، وہاں کے راج ہنس، اور موجودہ ایٹمی دور کے اثرات کو بہت درد مندی سے پیش کیا گیا ہے۔

یہ بہت بڑی علامتی و المیائی کہانی ہے کہ فکر رسا رکھنے والے اور حساس قاری اس کو پڑھ کر مسوس ہو ئے بنا نہیں رہ سکتے۔ ایٹمی دھماکے کا پس منظر، موروں کو علامت بناتے ہوئے یہ بتانا کہ وہ دھماکے سے قبل کی چہکار کو بھول کر اب گونگے ہو گئے ہیں۔ اس میں کس قدر گہرائی و گیرائی و معنویت ہے۔ کہانی میں سیاسی رنگ بھی در آتا ہے، اور مستقبل کے اندیشے بھی نظر آتے ہیں۔

عراق و امریکہ کی جنگ کی ہولناکی کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ احساس بیدار کیا جائے کہ جنگ سلامتی نہیں، تباہی ہے۔ اس سے کبھی انسانیت کو فلاح نہیں ملی، نسلیں شانت نہیں ہوئیں۔ اس کی وضاحت کے لئے 'مہابھارت'، سے واقعات اور 'ہیروشیما'، کی تباہی کا منظر پیش کرنے کا مقصد فقط جنگ کی ہولناکیوں کے بارے میں آگاہ کرنا ہے۔ ایٹمی تجربات کے باعث پیدا ہونے والے ایک بہت بڑے اندیشے کا انہوں نے کمال خوبی سے بیان کر دیا ہے۔

مصنف رات کو کسی بھی پہر گھر لوٹتا تھا، کھانا گھر پر ہی کھاتا تھا۔ ایک روز کھانا کھاتے ہوئے چڑیا کے پلیٹ میں روٹی کے ٹکڑے پر لپکنے کی وجہ سے مصنف ہر روز اپنے کھانے میں سے روٹی کے ریزے بنا کر ان کو ڈالتا ہے ایک روز اسے ہی مصنف کو ماضی کا ایک واقعہ یاد آ گیا جن دنوں مصنف نے ایک طوطا اور کبوتر کے دو جوڑے پال رکھے تھے۔ پھر مصنف ناشتہ کرتے وقت طوطے کو اپنا ہم ناشتہ بناتا اور اسے روس یا پراٹھے کے ریزے بنا کر کھلاتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ مصنف نے پہلے کبوتروں کو ناشتہ ڈالا جس وجہ سے مٹھو ناراض ہو گیا اور اس نے اس روز ناشتہ نہ کیا۔ مصنف نے پھر اس عمل کو تین چار بار دہرایا اور مٹھو ایسے ہی کبوتروں کو پہلے

ناشتہ ملنے پر احتجاج کرتا اور اس دن ناشتہ ہی نہ کرتا اور جس روز طوطے کو پہلے ناشتہ دیا جاتا وہ خوشی خوشی کھا لیتا تھا۔ اس واقعے کو مصنف نے ان الفاظ میں لکھا ہے:

"قریب ہی کبوتر دانہ چگتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کوئی ایک کبوتر مٹر گشت کرتے کرتے قریب آگیا۔ میں نے توس کے چند ریزے اس کے سامنے ڈال دئے۔ اس نے بڑے شوق سے ان ریزوں کو چگنا شروع کر دیا۔۔۔۔ مگر میں نے یہ دیکھا کہ مٹھو نے میرے اس فعل کو پسند نہیں کیا۔۔۔۔ وہ اس پر احتجاج کر رہا تھا۔"[7]

اسی طرح مصنف پھر سب سے پہلے مٹھو کو ہی توس کے ٹکڑے ڈالتا تھا۔ رات کو مصنف کا معمول بن گیا تھا کہ وہ رات کے کھانے میں اس چڑیا کو بھی ہم نوالہ بناتا تھا پھر ایک روز کمرے کا روشندان بند ہونے کے سبب چڑیا کمرے میں داخل نہ ہو سکی اور اس رات تیز بارش اور طوفان کے سبب آس چڑیا کی موت ہو گئی جس کی لاش مصنف کو اگلی صبح پارک میں سیر کے دوران نظر آئی تھی۔

اسی طرح "جبالا کا پوت" اس میں انتظار حسین نے گیان کی تلاش کو موضوع بنایا ہے۔ اس میں انتظار حسین نے علم سے متعلق بہت سے سوالات اٹھائے ہیں کہ کیا ایک انسان دوسرے انسان سے علم سیکھ سکتا ہے کیونکہ آج انسان کو خون خرابے اور دھوکہ بازی سے فرصت نہیں ملتی۔ ایسے میں وہ کسی اور کو کیا گیان دے سکتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار جبالا کا پوت گیان حاصل کرنے کے لیے جب لومارشی کے پاس جاتا ہے تو وہ اسے یہ کہہ کر واپس بھیجتا ہے کہ اپنے باپ کا نام ڈھونڈ کے لاؤ کہ تمہارا باپ کون ہے اور اس کا نام کیا ہے۔ وہ واپس جا کر اپنی ماں سے یہ سوال کرتا ہے۔ اس افسانے میں اس کی ماں کا کردار ناسٹلجیائی کردار کے طور پر نظر آتا ہے۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ کریں:

"میرے لال یہ تب کی بات ہے جب میں راج محل کی دھوبی گھاٹ بنی ہوئی تھی۔ راج کمار سے لے کے گھاٹ کے دھوبیوں تک اتنے مردوں سے ملی ہوں کہ اب کچھ یاد نہیں کہ ان میں تو کس کا بیج ہے۔"[8]

یہ سب سن کر وہ رشی کے پاس گیا اور ساری بات اسے بتائی۔ اس افسانے میں انتظار حسین نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دنیا کے ہر ذرے میں علم چھپا ہے اور ایک انسان تب تک اسے حاصل نہیں پاتا جب تک کہ وہ خود اس پر غور و خوض نہ کرے۔

اسی طرح "مانوس اجنبی"

یہ افسانہ پچھلے افسانے کا ہی شاخسانہ معلوم ہوتا ہے۔ گرچہ اس کی نوعیت قدرے مختلف ہے۔ انتظار حسین نے یہ باور کروانے کی کامیاب سعی کی ہے کہ انسان کے اضطراب کی وجہ فطرت سے دوری ہے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ جو سکون دیتی ہے، وہ موسیقی میں نہیں، انسان اپنی فطرت نہیں سمجھ پارہا، جس کو وہ ترقی کہہ رہا ہے، وہ ترقی نہیں، اضطراب ہے، بے سکونی ہے، مشکلات و پریشانیوں کا سبب ہے۔ یہ ترقی دھیرے دھیرے اللہ کی مخلوق زمین پہ معدوم کر رہی ہے۔ گویا انسان خود اپنی فنا کی طرف ترقی کے نام پہ تیزی سے سفر کر رہا ہے۔ وہ خود فطرت سے ہٹتا جارہا ہے، خود اپنا مستقبل خراب کر رہا ہے، خود آلودگی بڑھا رہا ہے۔ خود درخت کاٹ کر، ماحول کو خود اپنے ہاتھوں سے خراب کر رہا ہے۔ آہ۔۔ یہاں بین السطور فکر و غم کی اک دنیا آباد نظر آتی ہے۔
افسانے میں منظر نگاری بہت پُر لطف ہے۔ اس افسانے میں دور حاضر میں ہونے والی سائنسی ترقی کی بنا پر لوگوں کے طرزِ زندگی میں جہاں بدلاؤ آیا تو اس کے اثرات اس کے آس پاس کے ماحول پر بھی پڑے۔

"اللہ میاں کی شہزادی"

یہ افسانہ ماضی اور حال میں بیک وقت سفر کرتا ہے۔ پنن اس کہانی میں انتظار حسین کا اپنا ہی کردار محسوس ہوتا ہے۔ جو کم عمری کے ماضی میں اپنا آپ تلاش کر کے خوش ہو رہے ہیں۔ یہ سب یاد کر کے ان کے اندر مسرت کی لہریں دوڑ جاتی ہیں کہ ماضی کتنا خوبصورت تھا۔ جب سرحدیں نہیں تھیں، تو یہ موجودہ مسائل بھی نہیں تھے۔ سرحدیں کھنچ جانے کے بعد حالات و واقعات بدلتے ہیں تو انسانی سوچ بھی بدل جاتی ہے۔ حال کے مسائل اور مصائب و وحشتیں مل کر خوبصورت ماضی کو بھی دھندلا کر دیتے ہیں کہ وہ پوری توجہ سے ماضی میں یادوں کے ذریعے بھی سفر نہیں کر پاتے۔

اس طرح "مہاجن کے بندروں کا قصہ" پوری دنیا کے بدلتے حالات سے جو ایک گلوبل ویلج بن رہا ہے، یہاں انتظار صاحب اس کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس ترقی سے انسان اپنی شناخت کھو رہا ہے۔ نئی نسل کی نئی روش سے وہ فکر مند نظر آتے ہیں۔

سماجی اور نفسیاتی ناسٹیلجیا

انتظار حسین اپنے افسانے "مورنامہ" میں عراق پر ہونے والے امریکہ کے حملے کے بارے میں بیان کیا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں ہونے والی ظلم و بربریت کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے کہ کس طرح پہلے ماحول اور فضا پُر سکون تھی لیکن اب ان دھماکوں کی وجہ سے ہر چیز بدل گئی ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

"وہ راج ہنس موتی چگتے تھے اور مانسرور جھیل کے شفاف پانی میں تیرا کرتے تھے۔اب مانسرور جھیل کہاں ہے۔ لگتا ہے کہ سب جھیلیں خشک ہو گئیں۔ ندیوں کا پانی میلا ہو گیا۔ فضا بارود، دھوئیں، خاک دھول سے اٹی ہوئی ہے۔نعروں اور دھماکوں کے شور سے آلودہ ہے۔راج ہنس پاکیزہ فضا اور شفاف پانیوں کی تلاش میں کہیں دور نکل گئے۔"[۹]

یوں مصنف پہلے منظر کی یادوں میں کھویا رہتا ہے۔اس دہشت گردی کے خلاف جنگ کرنے فضا اور ماحول پر ہی اپنے اثرات مرتب نہیں کیے بلکہ انسانوں میں بھی خوف اور لا یقینی کی فضا قائم کر دی تھی۔ "شہر زاد کی موت" یہ ایک خوبصورت کثیر جہتی افسانہ کا ہے۔داستانوی رنگ اس کو بوجھل نہیں کرتا، اس میں روح پھونکنے کا کام کرتا ہے۔ بعض اوقات نامساعد حالات ہی انسان کے لئے سود مند ہوتے ہیں۔وہ اس کو بہادر اور باعمل بنا دیتے ہیں۔یہ فانی زندگی بہت ظالم شے ہے، جینے کے لئے انسان سولی چڑھ کے بھی جی لیتا ہے۔شہر زاد بھی یونہی جیتی ہے۔اس کی موت اس کی زندگی بنی رہی۔

دوسرے معنی میں تخلیق بعض اوقات فقط وقت وحالات کی وقتی پیداوار ہوتی ہے۔اگر حالات ساز گار ہو جائے تو یہ الٹے پیر پلٹ جاتی ہے۔یہاں کہانی میں موجودہ انسان کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔کہانی میں دلچسپی بھی بالکل ویسے ہی ہے جیسے الف لیلی کا لطف آتا ہے۔اس کہانی کا بہترین حصہ اس کا اختتام ہے۔جس میں کئی کہانیاں سانس لیتی نظر آتی ہیں۔زندگی اور موت کی ایک اور ہی تصویر دکھائی دیتی ہے

شہر زاد کی موت اصل میں یہ ہے، وہ نہیں تھی کہ اس کو قتل کر دیا جاتا۔اس افسانے میں اساطیر کے اندر ایک تخلیق کار کی زندگی کی حقیقت ہے۔

انتظار نے اپنے افسانے "شہر زاد کی موت" میں ماضی کے ایسے کردار منتخب کیے ہیں جو کبھی ماضی کا حصہ تھے۔بادشاہ شہریار ہر رات ایک عورت کو ملکہ بنواتا اور پوری رات اس سے کہانی سنتا اور صبح ہوتے ہی اس کا سر قلم کر دیتا تھا۔اسی طرح کا شہر زاد کا کردار ہمیں دکھائی دیتا ہے لیکن اسے اگلی صبح کو قتل نہیں کیا گیا۔وہ موت کے ڈر سے ایک ہزار ایک راتوں تک جاگ کر کہانیاں سناتی رہی۔اس کے بعد بادشاہ نے ہر روز ایک عورت کو قتل کرنے کی عادت کو چھوڑ دیا۔ اس افسانے میں شہر زاد کا کردار اور اس کی بہن دینازاد کا کردار ناسٹلجیائی کردار کے طور پر سامنے آئے ہیں۔یہ دونوں کردار ان چھوٹی بچیوں کو کہانی سنانے کے لیے ماضی کی راتوں کو یاد کرتی جو کہانیاں سناتے ہوئے گزری تھی۔ مصنف افسانے میں لکھتا ہے:

"یہ سب کہانیاں میں نے سنائی تھی، اسے کتنی حیرت ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ حیرت کی جگہ اداسی نے لے لی، اسے ایک ایک کر کے وہ ساری راتیں یاد آئیں۔ ایک ہزار ایک راتیں جب اس نے یہ کہانیاں سنائی تھیں۔ ہر رات یوں لگتا کہ اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔ مگر اب ان میں سے ہر رات یوں دکھائی دے رہی تھی کہ وہی اس کی زندگی کا حاصل تھی۔"[۱۰]

اُن راتوں کی یاد میں شہرزاد بہت اداس رہنے کے ساتھ بیمار بھی ہوگئی پھر بادشاہ نے اس اداسی کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ شہرزاد اپنی کہانیوں میں ہی زندہ تھی جب ان کہانیوں کے بدلے اس کی جان بخشی گئی تو اسی روز اصل میں شہرزاد کی موت واقع ہوگئی تھی کیونکہ شہرزاد کہانیوں کے کہنے کو ہی اپنی زندگی مانتی تھی۔ انتظار اپنے افسانوں میں جہاں ماضی اور ہجرت کی یادوں کو بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں وہیں ہمیں اکیسویں صدی میں شروع ہونے والی دہشت گردی کے نتیجے میں پروان چڑھنے والی خوف کی فضا کو بھی اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔

اسی طرح انہوں نے اپنے افسانے "ریزروسیٹ" میں ایک ایسی عورت کی کہانی بیان کی ہے جو کہ پرانے لوگوں کو اپنے خوابوں میں دیکھنے کے بعد انہیں اکثر و پیشتر یاد کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح وہ ان خوابوں کے ذریعے ماضی میں چلی جاتی تھی۔ پھر ایک روز دہشت گردوں کے حملے کے نتیجے میں اس کے پوتے کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ دراصل اس عورت کو خوابوں کے ذریعے مستقبل میں ہونے والے واقعات کا اشارامل جاتا تھا۔ وہ اپنے ان خوابوں کو سب لوگوں کو سناتی تھیں۔

"بڑی بوا کو اگلے پچھلے خواب بھی تو بہت یاد تھے۔ جس روز نیا خواب سنانے کے لیے نہیں ہوتا تھا، اس روز پرانے خوابوں کا بستہ کھول لیتی اور کئی کئی خواب سناڈالتیں۔۔۔۔ ارے ہندو مسلمان کی مار کاٹ تو بہت بعد میں ہوئی ہے۔ بڑے ابا نے تو خواب میں پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔" [۱۱]

اس کہانی میں ایک طرف تو موجودہ حالات کی گھمبیرتا ہے تو دوسری طرف یہ افسانہ روحانی و نفسیاتی بھی ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ خواب ایک علم ہے۔ اس کو ہم محض "نفسیاتی" عارضہ سمجھ لیتے ہیں۔ تو ایک طرف بظاہر ملک کے موجودہ حالات پہ تبصرہ ہے کہ نوجوان دہشت گردی کا نشانہ بن رہے ہیں، زندگی میں داخل ہونے سے قبل موت کے سفر ہی چلے جاتے ہیں۔ جس کے باعث عمر رسیدہ افراد

معاشرہ کی تعداد میں اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ یہ ایک لمحہ فکریہ ہے، کہ نوجوان جن کے کاندھوں پہ قوموں کا مستقبل ہو تا ہے، وہ ناکافی ہوئے تو قوم آگے کیسے بڑھے گی؟ ترقی کیسے ہو گی؟ خوف کی فضا میں زندگی سانس کیسے لے گی؟

"وارد ہونا شہزادہ تورج کا شہر کاغذاباد میں اور عاشق ہونا ملکہ قرطاس جادو پر" داستانوی رنگ میں لکھی گئی کہانی سفر سے شروع ہو کر سفر پہ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ بظاہر یہ عام سی کہانی لگتی ہے مگر اس میں پرت در پرت گہرائی ہے، پرت در پرت رازِ زیست ہیں۔ انسانی نفسیات کا عمیق مشاہدہ ہے، عمل و ردِ عمل کا دائرہ فطری ہے، انسان کو معلوم ہی نہیں ہو تا کہ اس کے اپنے کئے گناہ اور ناانصافیاں خوف و ناکامی بن کر اس کا پیچھا کرتے ہیں اور انسان کو مظلوم کی بددعا اور آہ لگ جاتی ہے۔

شہزادے نے اسلام کی آڑ میں بہت سو پر ظلم کئے جبکہ اسلام (یا کوئی بھی مذہب ہو) صرف امن ہے۔ تلوار کی ہر جا و ہر وقت اجازت نہیں دیتا۔ دین فطرت کسی کے ساتھ 'زبردستی' کو نہیں مانتا۔ مگر وہ ہر جا زبردستی، طاقت آزمائی کرتا ہے۔ وہ شہزادی مہتاب کو اسلام قبول کرواتا ہے تو شہزادی کو اس سے انس ہو جاتا ہے، پھر وہ اس کو روتا ہوا چھوڑ کر اپنے اگلے نام نہاد جہادی سفر پہ روانہ ہو جاتا ہے۔ وہ جہاں جاتا ہے اسلام قبول کروا کے شہزادیوں کو دھوکا دیتا ہے۔ مکافات عمل اور اللہ کی خاموش لاٹھی، انسان اس کو اپنی طاقت کے غرور میں بھلا بیٹھتا ہے۔ یہاں انتظار حسین نے اس کو آرٹ بنا دیا ہے۔ آخر میں محسوس ہو تا ہے کہ شہزادہ اندر سے کھوکھلا و خوف زدہ ہو گیا ہے اور مزید سفر خوف اور لاحاصلی کا ہے۔ وہ کانٹے جو اس نے دوسروں کے لئے بوئے تھے وہی اس کے بدن پہ چبھ رہے ہیں۔

اسی طرح ایک اور افسانہ "کلیلہ نے منہ سے کیا کہا؟" اس میں انتظار حسین نے موجودہ سیاسی نظام اور سیاسی کرداروں کا نقشہ بہت ہی جانبداری اور مہارت سے کھینچا ہے۔ یہ باور کروانے میں کامیاب نظر آتے ہیں کہ کوئی بھی جاندار کہیں بھی پہنچ جائے، کچھ بھی بن جائے، اس کی خصلت نہیں بدلتی۔ اگر چوہا ہے تو چوہا ہی رہے گا۔ گیدڑ ہے تو گیدڑ ہی رہے گا۔ انسان بھی خمیر ہی سے جڑا رہتا ہے۔ اس کا خمیر بدلے نہیں بدلتا، اس پر وہ ملمع کاری تو کر لیتا ہے، مگر وقت آنے پر اس کا رنگ اتر جاتا ہے۔ لہذا انسان کو اپنی خصلت نہیں بدلنی چاہئے، وہ خمیر سے بیڑ لے گا تو نقصان اس کا اپنا ہی ہو گا۔

یہ کثیر جہتی افسانہ ہے جو قومی معاملات سے شروع ہو کر بین الاقوامی سطح تک دیکھا جا سکتا ہے بلکہ اس کا کائناتی سطح پر بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے بس ذرا بصارت سے بصیرت کا سفر درکار ہے۔

"دمنہ کیوں ہنسا، کلیلہ کیوں رویا"

یہاں بات جانوروں پرندوں کی ہے، مگر مخاطب انسان ہے۔ علامتی افسانہ ہے۔ عصری صورتحال کے پس منظر میں ہے۔ بدلتے ہوئے معاشرتی و سیاسی حالات کی علامتی عکاسی ہے۔ ان شر پسندوں کی نشاہدہی ہے جو امن و سکون کو خراب کرتے ہیں اور پھر اس کو مسلسل خواب رکھنے میں بھرپور کردار ادا کرتے ہیں۔ ملک کی سیاسی جماعتوں نے سیاست کو جو تماشا بنا رکھا ہے اس پہ بات ہوئی ہے اور اس تماشے کی وجہ کوئی باہر کا تیسرا فریق آکر اپنی جگہ بناتا ہے تو بھی ہم باہر والوں کو الزام دیتے ہیں اپنے گریبانوں میں نہیں جھانکتے۔ حالات یہ ہیں کہ دعوے وفا کے سب کرتے ہیں، مگر موقع ملنے پہ، کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اس صورتحال میں دوسروں کو ملک کے داخلی معاملات میں دخل اندازی کی اجازت اور موقع دے کر خود اپنے پیروں پہ کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔ خود ملک کا امن برباد کرنے والی بات ہے۔ انتظار صاحب نے بہت سادگی و پُر اثر انداز میں اتنی بڑی بات بیان کردی ہے یہی ان کا فن ہے۔

"کلیلہ دمنہ ہٹ لسٹ پر،،

یہ افسانہ پچھلے ہی افسانے کا شاخسانہ ہے۔ جس میں انتظار حسین ملکی حالات پہ مسوس ہیں۔ افسانہ بظاہر جانوروں پرندوں کے منظر میں سیاسی فرشتوں کی طرف اشارہ ہے۔ جہاں منافقت عام ہے، سیاست دان کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ تعلیم و روشن خیالی کے نام پہ ڈگری تو قبول کی جاتی ہے۔ مگر روشن خیال ذہین قبول نہیں کیا جاتا، کیونکہ یہ قدامت پسندوں کی، جاگیروں، ان کی حکومتوں و حکمرانی کے لئے خطرہ ہے۔ وہ غریب کو ان پڑھ رکھ کر ہی اپنے مقاصد پورے کرتے رہے ہیں، ان کو ان کے قدموں پہ کھڑا ہی نہیں ہونے دیتے۔ پھر بھی اگر کوئی روشن خیال و ذہین، علم سے لبریز فرد آگے بڑھتا دکھائی دے تو اس کو کسی نا کسی چکر میں پھنسا کر ختم کروا دیتے ہیں۔ رستے سے ہی ہٹا دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ شعور کی پہلی سیڑھی ان کے لئے خطرہ ہے۔ اور وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے، جو ہے، جیسے ہے کہ بنیاد پہ خالی خُولی نعروں سے اپنا کام چلانا چاہتے ہیں۔ اس حوالے سے سے افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اس جنگل میں بندر سے بھی زیادہ جاہل اور وحشی جانور بسے ہوئے ہیں۔ سب سے بڑھ کر بھیڑیے ہیں کہ کل بھی بھیڑیے تھے آج بھی بالکل بھیڑیئے ہیں۔ سخت رجعت پسند، انسانیت دشمن، تنگ نظر۔۔۔۔ ہماری نئی نسل کے لبرل خیالات نے سب سے زیادہ

انہیں کو مشتعل کیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ ہمارے جنگل کے قانون کے خلاف سازش ہے" [۱۴]

اس طرح اس افسانے "چوہیانے کیا کھویا کیا پایا" اس کہانی میں علم کی اہمیت اور اس کی اصلیت کو بیان کیا گیا ہے۔ علم ڈگری کا نام نہیں یہ رویے کا نام ہے۔ معلومات اور علم میں بھی واضح فرق ہے۔ اس وقت ہم جس ڈگر پہ ہیں یہ معلومات تو ہو سکتی ہیں علم نہیں۔ انتظار حسین نے علم کو صوفیوں۔ ولیوں کے درجات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ علم تو عاجزی پیدا کرتا ہے، انکساری سکھاتا ہے، احترام آدمیت کے کا درس دیتا ہے۔ جو علم غرور پیدا کر دے، وہ علم نہیں۔ کہ پھلوں والی ڈالی تو ہمیشہ جھکی ہوتی ہے۔

یوں تو انتظار حسین کی ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی کردار ماضی میں پناہ لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے اسی طرح ان کے ایک افسانے "میرے اور کہانی کے بیچ" میں مصنف خود بھی ناسٹلجیا کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ جب اکیسویں صدی میں ہونے والی سائنسی ایجادات کی بدولت ایٹمی طاقت بننا اور ایٹمی دھماکے کرنے کا رواج چل نکلا۔ جب پاکستان میں ایٹمی دھماکے ایک پہاڑ پر کیے گئے تو اس پہاڑ کا رنگ بدل گیا اس منظر کو دیکھتے وقت مصنف اپنے بچپن میں اس وقت کو یاد کرتا ہے جب چاند یا سورج کو گرہن لگتا تھا تو ان کے والد نماز ادا کرتے تھے اور کہتے تھے ہر وقت چاند یا سورج کے لیے بہت بڑی آزمائش ہے پھر اسی بات سے مصنف اس پہاڑ کی شدید آزمائش کا احساس ہوا کہ یہ پہاڑ بھی ایک ایسی ہی اذیت ناک صورتحال سے دوچار ہے۔ اس سب کے باوجود مصنف ماضی کو ہی یاد کرتا رہتا ہے:

> "بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے اور میں تکیہ کرتا ہوں پرانی کہانیوں پر دیومالائی قصوں پر۔ یار کہتے ہیں کہ یہ پرانی قصے کہانیاں، یہ دیومالائیں انسانیت کے بچپن سے یادگار ہیں۔۔۔ سنا تو یہی ہے کہ مغرب میں سائنس اور فلسفہ کی گود میں پل کر وہ خیر سے بالغ ہو گیا ہے۔ اور عقل کا پتلا بن گیا ہے۔ ایٹم بم بھی اسی کی عقل کی کارستانی ہے مگر ہیروشیما بھی تو اسی کے شعور کا کرشمہ ہے۔" [۱۳]

مصنف اس سائنسی اور صنعتی انقلاب کے پیش نظر سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کے حوالے سے فکر مند دکھائی دیتے ہیں کہ کیسے درختوں کے کٹنے سے پرندے تو بے آشیانہ ہوئے ہی ہیں بلکہ انسانی صحت کے لیے فضا بھی زہر آلود ہو گئی ہے۔ پہلے صبح کی سیر کے وقت فضا میں کوئلوں کی خوبصورت آواز سے فضا گونج رہی ہوتی تھی لیکن اب درختوں کے کٹ جانے کے سبب ان پرندوں نے بھی خاموشی سے دوسرے علاقوں کا

رخ کر لیا تھا۔ یہ انتظار کی ایک خوبی ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کا بہت گہرائی سے مشاہدہ کرتے تھے اور پھر ان پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ انتظار حسین اپنے افسانوں میں ماضی کا بیان لازمی کرتے تھے چاہے وہ مذہبی تناظر میں ہو یا ہجرت کرنے کے حوالے سے ہو یا اپنی بستی کے احوال کو بیان کرنا مقصود ہو۔ انتظار کی ہر کہانی میں کسی نہ کسی طرح ہمیں ماضی کا نوحہ سنائی ہوئی دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہر بات، ہر چیز کے بیان میں ماضی سے کوئی حوالہ یا واقعہ تلاش کر کے بیان کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں حال کا مکمل اظہار ماضی کے بیان کے ساتھ ہی تکمیل پاتا ہے۔ ان کے ناسٹلجیائی کرداروں کے حوالے سے ڈاکٹر نگہت ریحانہ لکھتی ہیں:

> "انتظار حسین ماضی کے کھنڈروں کو بڑی محبت اور خلوص سے سجاتے ہیں۔۔۔۔ماضی کے معمولی معمولی واقعات کو بھی وہ بھلا نہیں سکے جو بقول ان کے چشم و دن میں زمانے کی مانند گزر چکے تھے۔ ان کے ذہن میں نجی یادیں ہی نہیں، نسلی یادیں بھی محفوظ ہیں۔" [۱۴]

انتظار حسین کے ان افسانوں کے علاوہ ہمیں قیوما کی دکان، خریدوں حلوہ بیسن کا، فجا کی آپ بیتی، رہ گیا شوق منزل مقصود، استاد، اجودھیا، ایک بن لکھی رزمیہ، آخری آدمی، زرد کتا، شہر افسوس، وہ جو کھوئے گئے وغیرہ میں ناسٹلجیا کے عناصر دکھائی دیتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی انتظار حسین کے افسانوں میں ہمیں ناسٹلجیا کی بھرپور عکاسی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی ہجرت ہی ناسٹلجیا کو پروان چڑھانے میں ہمیں پیش پیش نظر آتی ہے۔ ایک طویل عرصہ یہاں گزار لینے کے باوجود بھی وہ اپنی بستی، اپنے بچھڑے ہوئے لوگوں کو بھول نہیں پائے بلکہ انہیں اپنی یاداشت کے خانے میں ہمیشہ محفوظ رکھا۔ ان لمحات کو بھی یاد کرتے رہے جو ان کے لیے حال میں خوش گواریت کا باعث بنے رہے۔

حوالہ جات

۱۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، ہر جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص:۴۹۷

۲۔ شیخ محمد غیاث الدین، ہندہ مسلم فسادات اور اردو افسانہ، س ن، ص ۳۲۹

۳۔ انتظار حسین، علامتوں کا زوال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۵

۴۔ نیاز احمد (مرتب)، مجموعہ سہیل احمد خان، س ن، ص ۱۱۲ تا ۱۱۳

۵۔ انتظار حسین، مضمون: ہمارے عہد کا ادب، مشمولہ: سویرا، شمارہ ۳۱، آرٹ پریس، لاہور، س ن

۶۔ انتظار حسین، شہر زاد کے نام، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء ص ۷

۷۔ ایضا، ص ۶۹

۸۔ ایضا، ص ۹۸

۹۔ ایضا، ص ۴۴

۱۰۔ ایضا، ص ۳۷

۱۱۔ ایضا، ص ۱۷۴

۱۲۔ ایضا، ص ۱۲۸

۱۳۔ ایضا، ص ۱۳۴

۱۴۔ نگہت ریحانہ، ڈاکٹر، اردو افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ، س ن، ص ۲۱۲ تا ۲۱۳

باب سوم

محمد حمید شاہد کے افسانوں میں ناسٹلجیائی رجحان کا مطالعہ

الف: یاد ماضی اور ہجرت کے تناظر میں

محمد حمید شاہد پنڈی گھیب میں ۲۳ مارچ ۱۹۵۷ کو پیدا ہوئے۔ ان کے دادا پہلے ایک دیہات میں مقیم تھے اور پھر پاکستان بننے کے دو سال بعد وہ پنڈی گھیب کے نزدیک واقع ایک چکی نامی گاؤں سے ہجرت کر کے ایک حویلی میں سکونت اختیار کر لی۔ محمد حمید شاہد کے والد اپنے آبائی گاؤں سے بہت محبت کرتے تھے اسی لیے وہ چکی میں آتے جاتے رہتے تھے۔ حمید شاہد نے اپنی تعلیم کا سلسلہ اپنے علاقے کی درسگاہ سے ہی شروع کیا اور یہی حصول علم کا جذبہ انہیں فیصل آباد کی زرعی یونیورسٹی تک لے گیا۔ وہاں سے انھوں نے بی ایس سی کی تکمیل کی اور پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا لیکن اپنے والد کی علالت کے باعث وہ تعلیمی سلسلہ برقرار نہ رکھ پائے۔ والد کی وفات کے بعد محمد حمید شاہد نے زرعی ترقیاتی بینک میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔

محمد حمید شاہد کی ادبی زندگی کے حوالے سے بات کریں تو انہوں نے سکول کے زمانے میں ہی یعنی دسویں جماعت میں ایک تحریر لکھی تھی جو نوائے وقت میں چھپی۔ اس مضمون کے چھپنے کے بعد ان میں مزید لکھنے کا شوق اجاگر ہوا۔ حمید شاہد کے والد کو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا اور ان کے اس شوق کی وجہ سے ہی حمید شاہد میں بھی کتب بینی کا شوق پیدا ہوا۔ یہی شوق انہیں لکھت پڑھت کی طرف راغب کر گیا۔

ا۔ انہوں نے ۱۹۸۳ میں "پیکر جمیل" کے نام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے موضوع پر کتاب لکھی۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "بند آنکھوں سے پرے" ۱۹۹۴ میں شائع ہوا تھا۔ ان کی دیگر تخلیقات میں لمحوں کا لمس، پارو، اشفاق احمد شخصیت اور فن، اردو افسانہ صورت و معنی، مٹی آدم کھاتی ہے، محمد حمید شاہد کے پچاس افسانے وغیرہ ہیں۔ ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "جنم جہنم"، تیسرا مجموعہ "مرگ زار" ۲۰۰۴ میں چوتھا مجموعہ " آدمی" کے عنوان میں ۲۰۱۳ میں اور پانچواں مجموعہ "دہشت میں محبت ۲۰۱۵ "میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوی مجموعے "مرگ زار" میں ۱۵ افسانے شامل ہیں۔ اسی طرح افسانوی

مجموعے" آدمی "میں ۱۷ افسانے شامل ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعہ" دہشت میں محبت "میں تین افسانے نئے ہیں جن میں درج ذیل افسانے شامل ہیں

۱۔ خونی لام ہوا قتلام بچوں کا

۲۔ کوئٹہ میں کچلاک

۳۔ جنگ میں محبت کی تصویر نہیں بنتی

اس افسانوی مجموعے میں کل افسانوں کی تعداد گیارہ ہیں۔ یہ تین افسانے نئے ہیں جبکہ باقی آٹھ افسانے پہلے دیگر مجموعوں میں شائع ہو چکے تھے۔ ان کے افسانوں کو موضوعاتی اعتبار سے پرکھا جائے جائے تو ان کی کہانیوں میں ہمیں دیہی اور شہری زندگی کی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ کہانی اپنی مٹی سے جڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے افسانوں میں باطنی تجربوں کے ساتھ انسانی نفسیات کے حقائق کو بھی بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ان کے افسانے انفرادیت کی بنا پر اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ بھارت میں ان کا افسانہ "لوتھ" اپنی انفرادیت کی بنا پر نصاب کا حصہ بن چکا ہے۔ اسی طرح ان کا ایک افسانہ "مرگ زار" جب منظر عام پر آیا تو وارث علوی کو اس افسانے کی تکنیک بہت پسند آئی۔ وہ اپنی کہانی میں عصر حاضر کی معاشرت کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے مسائل کو بیان کرنے کا ہنر بھی خوب جانتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں اکیسویں صدی کے آغاز پر ہی ہونے والے نائن الیون کے واقعہ اور اس کے نتیجے میں ماحول پر پڑنے والے اثرات کو بھی بیان کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے حوالے سے محمد منشا یاد لکھتے ہیں:

> "محمد حمید شاہد کی کہانیاں خیالی اور مصنوعی نہیں ہیں۔ ہمارے اپنے ماحول اور ارد گرد کی سچی کہانی سچی اور بھرپور تصویریں ہیں۔۔۔۔ یہ کہانیاں سچ کی کوکھ سے پھوٹتی ہیں اور سچے انسانی جذبوں کو خلوص اور سچائی سے پیش کرتی ہیں اور اس امر کی گواہی دیتی ہیں کہ انھیں لکھنے والا ہر رنگ کی کہانی اور کہانی کے ہر رنگ کو اپنی گرفت میں لینے پر قدرت رکھتا ہے۔"[1]

ان کے افسانے اپنی مٹی کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں تو ان کے افسانوں کے کردار ہمیں ماضی کی یادوں میں کھوئے ہوئے ناسٹلجیائی کردار کے طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ "مرگ زار" ۲۰۰۴ میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ کل پندرہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کا پہلا افسانہ "برشور" ہے جس میں بلوچستان کی صورتحال کو بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح بلوچستان کے لوگ پرسکون زندگی گزار رہے تھے اور پھر کس طرح یہاں پر تباہی و بربادی نے قدم جمانا شروع کیے۔ جو لوگ بہت بڑے باغوں کے مالک تھے اور مہنگے داموں میں ہر سال اپنے باغ فروخت کرتے تھے اب وہ لوگ اپنا گزر بسر کرنے کے لئے امدادی ٹیموں کے منتظر نظر آ رہے تھے۔ ہر طرف ویرانی اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ جو ممبران بلوچستان کے مختلف علاقے میں دورے کر رہے تھے انہوں نے پہلے اس علاقے کو دیکھا ہوا تھا تو وہ اب کی اجڑی صورتحال سے بہت افسردہ ہو گئے تھے۔ اس افسانے میں ہمیں کاکڑ کا کردار ناسٹلجیائی کردار کے طور پر نظر آتا ہے۔ وہ اکثر تاج محمد ترین کی زندگی کی کہانی کو بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اکثر کہتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ اس کے دوست نے اپنی بیوی کے نام پر ہی اپنی دختر کا نام رکھا اور پھر اسی نام سے اس نے اپنے علاقے میں مسجد تعمیر کروائی۔ اس حوالے سے افسانے کا اقتباس پیش نظر ہے:

> "کاکڑ نے ہمیں بتایا کہ تاج محمد ترین اس کے بچپن کا دوست تھا۔ دونوں کوئٹہ کے پبلک اسکول میں اکٹھے پڑھتے رہے تھے اور تب دونوں کی کئی خوشگوار شامیں ہنہ جھیل پر یوں گزری تھیں کہ اسے ابھی بھی یاد آتی تھیں۔"[۲]

تاج محمد ترین نے جو اپنی بیٹی کے نام پر مسجد تعمیر کروائی تو اس کے بعد سے اس علاقے پر بارشوں کا سلسلہ تھم گیا اور اس کے باغ کم داموں فروخت ہونے لگے تھے۔ اس لیے اسے سود پر قرض لینا پڑتا اور پھر اسی قرض کو چکانہ پانے کے سبب اس شخص نے زبردستی اس کی بیٹی سے نکاح کروا لیا۔ اسی طرح ہمیں عبداللہ کا کردار جو پہلے چار ہزار سیبوں کے درخت کا مالک تھا۔ اب بارشیں نہ ہونے کے سبب وہ ہر سال نیا بور کرواتا تھا لیکن کچھ مہینے تو اس بور سے پانی نکلتا تھا اور پھر پانی خشک ہو جاتا تھا۔ اسی طرح وہ قرضہ لے کر مقروض ہوتا گیا اور اس کے حالات بہت بری طرح خراب ہوتے گئے تھے کہ اسے دوسروں کی مدد کی ضرورت پڑنے لگی۔ اس واقعہ کو حمید شاہد نے افسانے میں اس طرح بیان کیا ہے:

"چار ہزار درختوں والے کالا کلو سیبوں کے باغ کا مالک۔ اس کا باغ سات برس پہلے پہلی بار سترہ لاکھ میں بکا تھا۔ جب سے آسمان سے رحمت برسنا بند ہوئی، اس نے باغ بچانے کے لیے ہر سال نیا بور لگایا مگر پانی اتنا نیچے چلا گیا کہ ہر سال آٹھ دس لاکھ کسی پر اٹھ جاتے سیبوں کے باغ کا مالک مٹھی بھینچ کر تیزی سے سڑک سے اترا اور لورالائی کی سمت کھڑا ہوا۔ کاکڑ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ہمیں بتایا کہ وہ ہمیں امدادی سامان تقسیم کرنے والی ٹیم سمجھ بیٹھا تھا۔"[۳]

محمد حمید شاہد کے افسانوں میں ہمیں کرداری ناسٹلجیا کے ساتھ ساتھ ادیب کا ناسٹلجیا بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان کے ایک افسانہ "لوتھ" میں باپ اپنے تلووں پر بنے زخموں کو اپنے بیٹے سے چھپائے رکھتا ہے اور پھر ایک روز نائن الیون کے موقع پر طیاروں کے ٹکرانے والے منظر کو ٹی وی اسکرین پر دیکھتے ہوئے اس کے بیٹے کو باپ کے زخموں کا پتا چلتا ہے۔ تو وہ ڈاکٹر سے رجوع کرنے کے بعد آپریشن کے ذریعے باپ کی ٹانگیں کٹوانے پر رضامند ہو جاتا ہے۔ یہ تو بظاہر نظر آنے والے زخم تھے۔ جنھیں اس کے بیٹے نے ڈاکٹروں کی مدد سے باپ کی تکلیف کو کسی حد تک کم کر دیا تھا۔ لیکن ان زخموں کا کیا جو وہ اپنے دل میں چھپائے بیٹھا تھا۔ ان زخموں کو کون بھرتا۔ وہ ہر لمحے اپنے بیتے لمحوں میں ہونے والے اس حادثے کو یاد کرتا رہتا جب گہرے پانی کی موجوں میں اس کی ننھی سی بیٹی ڈوب گئی تھی۔ وہ اس کو ڈھونڈنے کے لئے جتن کر رہا تھا لیکن وہ اسے بچانے میں ناکام رہا۔ اب اتنے سال بیت گئے لیکن پھر بھی وہ اس واقعے کو بھولا نہ تھا۔ اس کے زخموں کو بھی اس کے بیٹے نے اس روز دیکھا تھا جب وہ نائن الیون کے واقعات میں دو طیاروں کے دو بلند و بالا عمارتوں کے ٹکرانے اور اس کے نتیجے میں بھڑکنے والی آگ اور اس تباہی کے مناظر کو دیکھ رہا تھا تو اس کے باپ نے اس منظر کو دیکھتے ہوئے اپنے پاؤں زمین پر مارے تو درد کی ٹیسوں کی وجہ سے اس کے منہ سے آہ و کراہت کی آوازیں نکلیں۔ تو اس وجہ سے بیٹے کی توجہ ان زخموں کی طرف جاتی ہے۔ اس افسانے میں بیٹے کا کردار ہمیں انتہائی بے حس کردار کے طور پر نظر آتا ہے۔ جو باپ کی ٹانگوں کا علاج کروانے کے لیے بات کی ٹانگیں کٹوا دیتا ہے۔ وہ باپ اپنی ٹانگیں کٹنے کے سبب ملنے والے نئے گھاؤ کو اپنے بیٹے سے چھپاتا ہے کہ کہیں وہ اس گھاؤ کے ساتھ بھی اسی طرح سلوک

کرے گا جو اس کی ٹانگوں کے ساتھ کیا ہے۔ مصنف بیٹے کی بے حسی اور باپ کے زخموں سے لاعلمی کو اس طرح بیان کرتا ہے:

"ہوا یوں تھا کہ اس کا بیٹا ٹی وی کے سامنے بیٹھا بار بار دکھائے جانے والے وقت کے عجوبہ سانحے کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ پہلے ایک طیارہ آیا،۔۔۔ایک فلک بوس عمارت سے ٹکرا گیا، شعلے بھڑک اٹھے۔۔۔ وہ اپنے بیٹے کے عقب میں بیٹھا یہ سارا منظر انوکھے اطمینان سے دیکھتا رہا۔۔۔ انوکھی طمانیت کی بھیک کے باعث اس نے اپنے ہی تلووں کے زخمی حصے کو سختی سے دبا لیا تھا جس کے سبب اس کے ہونٹوں سے سسکاری نکل گئی تھی بیٹے نے پلٹ کر دیکھا۔۔۔ اسے گلہ تھا کہ آخر اس سے ان زخموں کو اوجھل کیوں رکھا گیا تھا؟"[۴]

اسی طرح ہمیں باپ کا کردار تکلیف اور کرب میں مبتلا اس وقت بھی دکھائی دیتا ہے جب وہ برسوں پہلے اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ ٹرین کا سفر کر رہا تھا اور وہ ریل گاڑی نہر کے اوپر سے گزری، جو اب دریا کا روپ دھار چکی تھی۔ یہاں کا پل ٹوٹ چکا تھا۔ اس لیے مسافروں کو ان بھری ہوئی لہروں کے درمیان ہی ریل سے اترنا پڑا۔ تو کچھ لوگ ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنی مدد آپ کے تحت ان موجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے کنارے تک پہنچ گئے تھے۔ ان سب کی دیکھا دیکھی شخص نے بھی ہمت کی اور اپنی بیٹی کو کندھے پر بٹھا لیا اور بیوی کو تجویز کی کہ وہ صرف کنارے پر ہی نظریں جمائے آگے بڑھتی رہے مگر اس کی بیوی امید سے تھی اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائی تو اس کے شوہر نے اس کو بچانے کی کوشش کی تو اس دوران کندھے پر بیٹھی وہ ننھی گڑیا موجوں کی نذر ہو گئی۔ اس شخص نے اسے بہت ڈھونڈا لیکن وہ جلد ہی پانی کی روانی میں بہہ کر دریا کی نذر ہو گی۔ اسی طرح وہ کرب ناکی کے عالم میں کنارے پر پہنچے اور اسی کنارے پر اس بیٹے کی ولادت ہوئی تھی، جو اب اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ اپنے والد کی ٹانگیں کٹوانے کا کٹھن فیصلہ کر لیا۔ اس افسانے میں ہمیں باپ کا کردار ناسٹلجیائی کردار کے طور پر دکھائی دیتا ہے۔ وہ ماضی میں ہونے والے حوادث اور ان سے ملنے والے زخموں کو اپنے دل میں چھپائے پھرتا ہے۔ اس حوالے سے افسانے کا اقتباس ہے:

"اس نے بیوی کو چکرا کر پانی پر گرتے ہوئے دیکھا تو اسے سنبھالنے کو لپکا، ننھی بیٹی کو کندھے سے لگی تھی اس پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ بیوی کو سنبھالتے سنبھالتے بیٹی پانیوں نے نگل لی۔۔۔ وہ عین بسین کے وسط سے دکھ سمیٹ کر واپس پہلے کنارے پر پلٹ گئے۔"[۵]

محمد حمید شاہد کا افسانہ "تکلے کا گھاؤ" میں ایک لکھاری کمرے میں بیٹھا ہوا کہانی لکھ رہا ہے۔ اس افسانے میں ہمیں نئی اور پرانی نسل اور تہذیب کی توڑ پھوڑ دکھائی دیتی ہے کہ پہلے کی زبان و بیان میں اور اب کی زبان و بیان، بول چال کے انداز میں بہت تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔ کہانی لکھنے والا اپنی زبان میں کہانی لکھ رہا ہے جبکہ اس کا بیٹا اس کے بولنے کا انداز بالکل مختلف ہے۔ وہ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے الفاظ کو بھی شامل گفتگو کرتا ہے۔ دور حاضر میں نئی نسل جو اپنی تہذیب سے دوری کے سبب اپنے والدین سے بات چیت کرنے کے آداب کو بھی فراموش کرچکی ہے۔ یہاں ہمیں اس افسانے میں عاصم کا کردار اپنے والد کو جو اس کے کمرے میں بیٹھ کر کہانیاں لکھنے کا عادی ہے۔ اس کو کمرے سے نکالنے کے درپے ہے۔ اسی دوران وہ لکھاری یہ سوچتا ہے کہ یہ کمرا پہلے اس کا ذاتی کمرا تھا۔ لیکن اب اس نے اپنی بیوی کی فرمائش پر یہ کمرا اپنے بیٹے کو دے دیا ہے۔ اس طرح ہمیں اس ادیب کا کردار ناسٹلجیائی کردار کے طور پر دکھائی دیتا ہے۔

"یہ بجا کہ کبھی یہ میرا کمرہ ہوتا تھا میں یہیں کتابوں میں گم رہتا تھا، کہانیاں پڑھتا اور کہانیاں لکھتا تھا۔ معنی اور جمال کا عجیب جہان تھا کہ جس میں، میں کھویا رہتا تھا۔ میں تخلیقی وفور کے اس تجربے میں نہال تھا۔۔۔ مگر فوزیہ کا خیال تھا یہی کہانیاں میری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھیں لہذا اس نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں اپنے مطالعے کے کمرے سے ساری کتابیں سمیٹ لوں اور ٹرنکوں میں بند کر دوں یا پھر پرانی کتابوں کی دکان پر بیچ آؤں۔"[۶]

"معزول نسل" افسانے میں محمد حمید شاہد نے ایک نمبردار اور اس کی بیٹیوں کی کہانی بیان کی ہے۔ اس افسانے میں ناسٹلجیا کا اظہار کئی جگہوں پر دکھائی دیتا ہے۔ جب عاشی اسٹیشن سے اپنے علاقے کی طرف جا رہی تھی تو یہاں سے گزرتے وقت وہ پہلے وقتوں میں سفر کرنے والوں کی بابت سوچ رہی تھی کہ وہ لوگ کس

طرح پیدل سفر کیا کرتے تھے۔ اسی طرح اس علاقے میں جہاں نمبر دار رہتا تھا۔اس علاقے کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ علاقہ پہلے دریائے نیلان کی گذر گاہ تھی۔ پھر رفتہ رفتہ یہاں سے گزرتا پانی اپنے ساتھ لائی ریت، مٹی یہاں چھوڑ جاتا تھا۔ جس کے سبب یہاں کی ڈھلوان کم ہوتی گئی اور پھر اس دریا نے اپنا رخ یہاں سے بدل لیا۔اس حوالے سے افسانے سے مثال دیکھیں:

"مشہور تھا کہ وہ کوس کی یہ پٹی کبھی دریائے نیلان کے پانیوں کی گزر گاہ تھی۔ ایک ہی وقت میں نہیں وقفے وقفے سے۔۔۔ ایسے ہی نیلان پہلو بدلتا رہا تھا۔۔۔ حتیٰ کہ دو کوس کا یہ ٹکڑا پوری طرح ریت سے اٹ گیا۔۔۔عاشی کے دل کے بیچ، ماضی کے گزرے لمحے اپنی جڑوں سے اکھڑ کر محبت کے پر جوش پانیوں کے سنگ بہتے ہوئے اس پاٹ سے اپنی گزر گاہ بدل رہے تھے۔"[۷]

ایک روز نمبر دار کو سانپ نے کاٹا اور وہ مرتے وقت اپنی بیوی رضیہ کو اپنی دونوں بیٹیوں کی دیکھ بھال کرنے کی وصیت کر گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر ہجرت اور فسادات کے واقعات کی زد میں تھا۔لوگ اپنے بستے گھروں کو چھوڑ کر جا رہے تھے۔ لیکن یہ ایک ایسا علاقہ تھا جہاں پر فسادات کے واقعات بھی نہ ہونے کے برابر ہوئے اور صرف دو خاندانوں نے ہجرت کی تھی اور پھر ان دو خالی گھروں میں میں اور لوگ آ کر آباد ہو گئے تھے۔ افسانے کے اس حصے میں بھی ہمیں ناسٹلجیا دکھائی دیتا ہے۔ پھر ان دونوں بہنوں کی شادی ہو جاتی ہے۔عاشی شادی کے بعد شہر میں رہائش اختیار کر لیتی ہے اور صفو شادی کے بعد اسی گھر میں رہتی ہے۔ پھر وقت اتنی تیز رفتاری سے گزرتا ہے کہ عاشی کے بیٹے فیکٹریوں کے مالک بن جاتے ہیں اور اس کا شوہر حصول معاش کیلئے بیرون ملک ہجرت کر کے جاتا ہے اور پھر وہ اسی ملک میں مستقل سکونت اختیار کر لیتا ہے۔ نہ ہی بیٹوں کے پاس عاشی کے لئے وقت ہوتا ہے۔تو عاشی پھر اپنے گاؤں کی طرف رخ کرتی ہے۔ اتنے سالوں بعد عاشی جب اپنے علاقے کے اسٹیشن پر اتری تو وہ گزرا ہوا وقت، ایک منظر کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ وہاں کھڑے اونٹ والے کو دیکھ کر اسے شکورا منداتی کی یاد آئی۔ جب عاشی یہاں سے رخصت ہو کر گئی تھی اس وقت شکورے کی عمر بھی اتنی ہی تھی جتنی کے اس وقت اس شخص کی تھی۔ یہ شکورے کا بیٹا تھا۔ وقت اتنی تیزی سے گزرا تھا کہ عاشی اپنی جوانی کے دور میں یہاں سے گئی تھی لیکن اب

بڑھاپے کی سرحد پر سفر رواں تھا۔ اب وہ اسٹیشن پر کھڑی گاڑیوں کو چھوڑ کر اس اونٹ پر سفر کرنا شروع کیا۔ اس دوران وہ اونٹ والا ماضی کے قصوں کو عاشی کے گوش گزار کرتا رہتا ہے کہ پہلے اونٹ کی وجہ سے اس کا گھرانہ بہت خوشحال تھا کہ وہ ان دنوں گاؤں میں آنے والے مہمانوں سے کرایہ وصول نہیں کرتا تھا لیکن اب موٹر گاڑیوں کے آنے سے اس کا گزر بسر بہت مشکل سے ہو گیا ہے۔ کیونکہ زیادہ تر لوگ ان گاڑیوں پر سفر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ شتربان کا کردار ہمیں افسانے کے اس حصے میں ناسٹلجیائی کردار کے طور پر دکھائی دیتا ہے اس کی مثال دیکھیں:

"وہ گزرے وقت کو اچھا کہہ رہا تھا، جب اونٹوں کے طفیل اس کے گھر میں خوشحالی کی ریل پیل تھی۔ وہ جنگل سے لکڑیاں شہر پہنچاتے تھے اور شہر سے اسباب گاؤں لاتے تھے۔ جبکہ گاؤں کے مہمانوں کو بلا اجرت اسٹیشن لے جاتے اور لے آتے تھے۔ مگر اب تو صرف یہی اسٹیشن کی سواریاں رزق کا وسیلہ تھی۔"[۸]

شتربان کے مطابق سب کچھ بدل گیا ہے لوگوں کے رہن سہن ہر چیز ہی تو بدلاؤ کا شکار ہو گئی ہے۔ جب امن پور میں داخل ہوئے تو عاشی کو اتنے سالوں بعد ہر چیز بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس افسانے میں گاؤں اور شہر کی زندگی کے ساتھ ساتھ ماضی کی عکاسی بھی حمید شاہد نے بہت خوبصورتی سے کی ہے۔

افسانہ " موت کا بوسہ " ایک ادیب کی موت کی کہانی ہے۔ اس کے اس دنیا سے رخصت ہونے اوراس کے پیچھے اس کے لواحقین کا اس کے چلے جانے کا ماتم کرنا بیان کیا گیا ہے۔ اسی رونے دھونے کے دوران وہ سب مرحوم کی زندگی کی یادوں کو بیان کرکے رو رہے تھے۔ اس افسانے میں ہمیں ادیب کا ناسٹلجیا دکھائی دیتا ہے۔ جو اپنے دوست کی موت کی خبر سنتا ہے تو ماضی کی یادوں میں کھو کر اس سے ہونے والی ملاقاتوں کو سوچتا رہتا ہے۔ اپنے اس سے جو ملاقات ہوئی اس کے حوالے سے افسانے کا اقتباس ملاحظہ کریں:

"میری اس سے کی ملاقاتیں ہوئیں۔۔۔ وہ سب ملاقاتیں اوران میں ہونے والی باتیں مجھے یاد ہیں۔ مگر ان یادوں اور باتوں میں گردے کا عارضہ کہیں نہیں تھا۔۔۔

مگر میرے سامنے ہمیشہ ایک مضبوط دل والا شخص ہی رہا۔ ایسا شخص جو کچھ بھی نہ تھا اور
اپنی ہمت سے بہت کچھ بن گیا تھا۔"[9]

اس فسانے "ادارہ اور آدمی" میں مصنف نے سرکاری اداروں اور ان میں کام کرنے والوں کی کہانی گوش گزار کی ہے۔ کہ پہلے ان سرکاری دفتروں میں کام کرنے والوں کو اہمیت کا حامل اور قابل احترام سمجھا جاتا تھا مگر اب اس قدر تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ ان اداروں کی اہمیت بڑھ کر ملازمین سے زیادہ ہو گئی ہے۔ یہ ملازمین پہلے کی طرح ہی کام کرتے تھے مگر ان کے کام کو وہ پذیرائی حاصل نہ تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ اس افسانے میں ہمیں ریاض کا کردار ناسٹلجیائی کردار کے طور پر دکھائی دیتا ہے۔ جب اس کا باس اس ادارے کو ماں جیسا قرار دیتا ہے تو اسے اپنی ماں کی وہ بات یاد آجاتی ہے۔ جب وہ کہا کرتی تھی کہ زمین ماں کے مترادف ہوتی ہے۔ ریاض کو وراثت میں جو زمین ملی تھی چونکہ وہ اپنی دو بہنوں کا اکلوتا بھائی اور اپنی بوڑھی ماں کا واحد کفیل تھا۔ اس نے بہن کی شادی کے موقع پر زمین کے اس ٹکڑے کو بیچنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس وقت اس کی ماں نے زمین والا جملہ بولا تھا۔ اس حوالے سے افسانے سے ایک مثال پیش نظر ہے:

"جب بھی مسٹر کے ایم رضوانی چھوٹی صنعتوں کے اس بڑے ادارے کو ماں کی مثل قرار دیتے، ریاض کو زمین کے بارے میں اپنی ماں کی کہی ہوئی بات یاد آجایا کرتی کہ بیٹا زمین بھی ماں کی طرح ہوتی ہے اپنے بیٹوں کی رگوں میں دودھ کے نور جیسا پاک رزق اتارنے والی۔"[10]

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر چیز اپنی اہمیت کھو چکی تھی۔ پہلے ان اداروں میں کام کرنے والے ان تھک محنت سے کام کر کے عزت اور وقار حاصل کرتے تھے۔ تب وہ سب مل جل کر ایک ٹیم کی صورت میں کام کرنے کو بہتر سمجھتے تھے۔ مگر اب وہ دیے گئے قوانین کے مطابق بھی کام کرے تو ان کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی بلکہ اس میں سے غلطیاں نکال کر اس پروجیکٹ کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح ان ملازمین میں خود اعتمادی کی کمی واقع ہو جاتی ہے اور پھر ہمیں ریاض کا باس اس حصے میں ناسٹلجیا کا شکار دکھائی دیتا ہے:

"ریاض کے باس کو وہ وقت بہت یاد آتا تھا، جب سرکاری اداروں کی ملازمت عزت اور وقار کی بات تھی۔ تب کلرک کی بھی ایک دھج ہوا کرتی تھی جبکہ انھیں سولھویں اسکیل کا افسر لیا گیا تھا۔ اس نے خوب محنت کی۔ ان دنوں محنت اور خدمت ایمان کے ہم پلا لگتے تھے۔۔۔"[۱۱]

افسانہ "مرگ زار" میں مصنف ایک شہید ہونے والے کی کہانی بیان کرتا ہے کہ مصعب شہادت کے لیے اپنی ماں، اپنی بہن اور اپنے بھائی سے دعا کروایا کرتا تھا۔ جب اس کے بھائی کو اس کی شہادت کی اطلاع ملی تو وہ حواس باختہ ہو گیا اور اس شہید بھائی کی وصیت کو پورا کرنے کے لئے اس کے جنازے میں شرکت کے لیے حیات آباد گیا۔ وہاں اپنے بھائی کے جسد خاکی کو دیکھ کر وہ غم سے نڈھال ہو گیا۔ اس کا جسم بوٹیوں کی صورت میں کفن میں لپٹا ہوا تھا۔ پہلے تو اسے لگا کہ یہ اس کے بھائی ہی نہیں ہے مگر پھر جب اس نے اپنے بھائی کا کٹا ہوا بازو دیکھا تو وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ ہمیں اس افسانے میں راوی کا کردار ر دار ناسٹلجیائی کردار کے طور پر دکھائی دیتا ہے کہ جب وہ اپنے بھائی کا کٹا ہوا لاشا دیکھ رہا ہوتا ہے تو اس کی قربانی کو دیکھ کر اسے اپنے تایا کی قربانی یاد آ گئی جو ہجرت اور فسادات کے واقعات میں جان کی بازی ہار گیا تھا۔ افسانہ میں اس منظر کو کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"۔۔۔ایسا کہتے ہوئے راوی کے ہونٹوں سے سسکی نکلی تھی (جب اس کی سسکی نکلی تو میرا گمان ہے کہ راوی نے اپنے اس تایا کو یاد کیا ہو گا جو ہجرت کرتے ہوئے مارا گیا تھا اور اس پھوپھی کی بابت بھی سوچا ہو گا جو اٹھالی گئی تھی)"[۱۲]

اسی طرح مصعب کی ماں اس کی شہادت کے بعد اس کو یاد کر کے روتی رہتی اور وہ بیٹے کی شہادت کو یاد کرتے ہوئے اسے شہدا کربلا کی یاد آ گئی کہ کس طرح کوفیوں نے ان کے ساتھ غداری کی۔ نیز اسے اپنے بیٹے کی قربانی کے طفیل ہونے والی تمام قربانیاں یاد آنے لگیں۔ ادیب اس حوالے سے افسانے میں لکھتا ہے:

"ماں اب مصعب کو یاد کر کر کے روتی تھی اور زور زور سے بین کرتے ہوئے انھیں بھی یاد کرتی تھی جن سے کوفے والوں نے غداری کی تھی اور جنھیں کربلا میں شہید ہونا پڑا تھا۔ وہ ان مقدس ہستیوں کو روتے روتے تقسیم کے دوران اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں کو یاد

کرنے لگتی تھی اور وہ سارے آنسو بہا دینا چاہتی تھی جو بیٹے کی شہادت کی خبر سن کر اس نے روک لیے تھے۔"[۱۳]

محمد حمید شاہد کے افسانوں کا مجموعہ "آدمی" کے پہلے افسانے "شاخ اشتہا کی چٹک" کا جائزہ لیں تو ہمیں اس افسانے میں ایک ایسے شخص کی کہانی دکھائی دیتی ہے جو اپنے گھر کے حالات ناساز ہونے کے سبب شہر میں آکر کام کرنے لگتا ہے۔ شکیل کا والد اپنے دوست کے ساتھ شکیل کو کام کے لئے شہر بھیج دیتا ہے۔ وہ بہت خوش شکل اور خوبرو تھا۔ ایک دکان کا مالک اسے دکان پر کام کے لیے رکھ لیتا ہے اور اس کا جنسی استحصال کرتا ہے۔ شکیل یہاں سے ملازمت چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور پھر اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ اور وہ شادی کے بعد اپنی ادھوری تعلیم کو مکمل کرتا ہے۔ اسی دوران اپنی شاعری کی وجہ سے وہ جلد ہی شہرت حاصل کر لیتا ہے۔ تو وہ اتنے سالوں بعد اپنے دوست کو کریانے کی دکان میں ہونے والے واقعات کو بتاتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے۔ اس افسانے میں شکیل کا کردار ماضی کو کھوجتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ تو اس کے ساتھ ہی ہمیں ادیب کا ناسٹلجیا بھی دکھائی دیتا ہے۔ جب وہ شکیل سے ہونے والی اپنی پہلی ملاقات کو بیان کر رہا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ کریں:

"شکیل سے میری پہلی ملاقات کسی تقریب میں ہوئی تھی۔ وہ وہاں دوسرے شاعروں کی طرح اپنی غزل سنانے آیا تھا۔۔۔ مجھے اس کا ٹھہر ٹھہر کر شعر پڑھنا اور پڑھتے ہوئے مصرعے کو ایک ادا سے دہرانا اچھا لگا تھا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ پہاڑیا ہے تو اور بھی اچھا لگا کہ وہ اس کے باوجود نہ صرف ہر مصرع میں ٹھیک ٹھیک لفظ باندھنے کا اہتمام کر لایا تھا ان کی ادائیگی میں بھی کوئی غلطی نہیں کر رہا تھا۔"[۱۴]

اس افسانے میں مصنف جب شکیل کے کردار کو بیان کرتا ہے تو اس کے ماضی کے حوالے سے ہی زیادہ تر ذکر ملتا ہے۔ جب وہ اس دکاندار کے پاس سے ملازمت چھوڑ کر دوسری ملازمت ڈھونڈ رہا تھا تو جہاں اسے نئی ملازمت ملی تھی اس شخص نے اپنی بیٹی صفیہ کی شادی شکیل سے کروا دی۔ یوں شکیل کو نوکری کے ساتھ ساتھ گھر دامادی بھی ملی۔ شکیل کا کردار ناسٹلجی کردار کے حوالے سے اہم کردار کے طور پر دکھائی دیتا ہے۔ افسانہ "ملبا سانس لیتا ہے!" میں مصنف نے ۲۰۰۵ء میں جو زلزلہ آیا تھا۔ اس کے نتیجے میں

ہونے والی تباہ کاریوں کو بیان کیا ہے تو دوسری طرف یہ فضل جو کی زندگی کی کہانی ہے ۔جس میں اس کی جوانی سے لے کر بڑھاپے تک کے تمام واقعات کو بیان کیا گیا ہے ہمیں فضل جو کے کردار کے ساتھ جیبجو کا کردار بھی ناسٹلجیائی کردار کے حوالے سے اہم کردار ہیں۔ جیبجو کمہار ہر نماز سے پہلے مسجد میں مشکیزے کی مدد سے پانی بھر کر رکھتا تھا۔ جس سے ہر نمازی مسجد میں آکر وضو کرلیتا تھا۔ جیبجو خود صرف عید کی نماز ادا کرتا تھا۔ وہ خود پانی بھرنے کی اس ذمہ داری سے اکتاہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ اس نے یہ ذمہ داری اپنی خوشی سے قبول نہ کی تھی بلکہ پانی بھرنے کا یہ کام اس کا والد بھی کیا کرتا تھا۔ ایک روز سردیوں کی صبح جب وہ پانی بھر کر لا رہا تھا تو اس کے پاؤں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور وہ پھسل کر گرا اور اس کا سر کسی نوکیلی چیز سے ٹکرایا اور پانی کا مشکیزہ بھرا ہوا اس کے اوپر ہی بہہ گیا۔ پھر وہ کچھ دیر بعد خود کو سنبھالتے ہوئے گھر کی طرف پلٹا تو وہ بخار کے شکنجے کی زد میں تھا۔ اور اس نے صرف اپنے بیٹے کو پانی بھرنے کی ذمہ داری سونپی اور خالق حقیقی سے جاملا۔ جیبجو کمہار پانی لے جاتے ہوئے اکثر یہ سوچتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے:

"اس کا باپ بہت پہلے شدید سردیوں میں ابھی تاروں کی چمک مدہم نہیں ہوئی تھی اور شیدے بانگی نے فجر کی اذان بھی نہیں دی تھی، پانی بھر کر لاتے ہوئے عین مسجد کی پرلی نکر کے پاس ٹھوکر کھا کر منھ کے بل گر گیا۔۔۔۔ بھیگا باپ ٹھٹھر کر مر گیا۔ اسے مشک سے نفرت ہو گئی۔۔۔۔ مگر وہ اس نفرت کے ساتھ زندہ رہنے پر مجبور تھا۔"[۱۵]

اس افسانے میں ہمیں ماسٹر فضل جو کا کردار بھی ماضی کی یادوں کو سوچتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کہانی میں فضل جو مسجد کے امام کا بیٹا ہے۔ وہ جیبجو کمہار کی بیٹی فضیلت سے شادی کرتا ہے۔ فضیلت اور اس کا ساتھ صرف چار سال تک رہا اور وہ بیٹے کی پیدائش پر جان کی بازی ہار گئی۔ اس دنیا سے چلے جانے کے بعد فضل جو اسی کی یادوں کے سہارے زندہ رہا اور اپنے بڑھاپے میں آکر ان گزرے دنوں کو شدت سے یاد کرنے لگا۔ وہ بچپن کے دنوں کے بارے میں سوچ رہا ہوتا تھا، تو کبھی اپنے والدین کے ساتھ گزارے وقت کو سوچتا تھا، تو کبھی وہ فضیلت کی یادوں میں کھو جاتا تھا۔ اس حوالے سے ایک مثال ملاحظہ کریں:

"جب وہ چھاتی سے قرآن لگائے فضیلت کو سوچنے لگتے تو ڈھیروں وقت تیزی سے معدوم ہو جاتا تھا۔ جتنا وقت انھوں نے فضیلت کو سوچتے گزار دیا تھا، اتنا تو وہ ان کے پاس رہی

بھی نہیں تھی۔۔۔ ان چار برسوں کی رفاقت انھوں نے کھینچ تان کر ساری عمر پھیلا لی تھی۔ چپکے سے چلے جانے والی، پنجوں کے بل چل کر آ جاتی تھی اور سارے میں اجالا پھیل جاتا تھا۔"[١٦]

بیوی کو پڑھانے والے اس واقعے کو یاد کرتا تھا، کبھی وہ اپنے والدین کے ساتھ گزارے وقت کو سوچتا رہتا ہے۔ ان یادوں سے فضل جو کا اتنا گہرا تعلق تھا کہ نہ صرف جاگتے ہوئے ان لمحات کی خوشگواری کو محسوس کرتا تھا بلکہ وہ سونے کے بعد بھی گزرے ہوئے لمحے اور اپنے قریبی بچھڑنے والوں کو خواب میں دیکھا کرتا تھا ۔فضل جو زندگی کے آخری حصے میں اپنا زیادہ تر وقت قرآن پاک پڑھنے میں گزارتا تھا۔ جس روز زلزلہ آیا تھا ،اس وقت بھی وہ قرآن پڑھ رہا تھا۔ جب اسے زلزلے کے جھٹکے محسوس ہوئے تو وہ سرہانے پر قرآن کو کھلا رکھ کر دروازے پر دیکھنے گیا۔ پھر اسے اپنی ماں کا جملہ یاد آیا جو اسے کہا کرتی تھیں کہ قرآن کو کبھی بھی کھلا نہیں چھوڑتے ہیں ورنہ شیطان اسے پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ تو وہ جلدی سے اندر آیا اور قرآن مجید کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا کر اسی جگہ جا کر دوبارہ کھڑا ہو گیا۔ یہ اسلام آباد میں واقع مارگلہ ٹاور میں موجود تھے اور اس ٹاور کے ملبے کے نیچے بہت سے لوگ دب گئے وہ سب لوگ مدد کے لیے پکارتے رہے لیکن کسی کو مدد ملی اور کچھ مدد کی فریاد کرتے رہ گئے تھے۔ لیکن ان تک کسی قسم کی امداد نہ پہنچ سکی۔ بالکل اسی طرح فضل جو بھی اس ملبے کے نیچے سے آوازیں لگاتا رہا، لیکن کسی نے اس کی فریاد نہ سنی۔

ب۔ سماجی اور نفسیاتی ناسٹلجیا

محمد حمید شاہد کے افسانے "گانٹھ" میں ایک ایسے پاکستانی ڈاکٹر کی کہانی کو بیان کیا ہے جو کئی برسوں سے امریکہ میں نہ صرف مقیم ہیں۔ بلکہ پوری طرح سے ان کے رنگ میں ڈھل گیا ہے۔ اس کا طرزِ زندگی یہاں تک کہ اس نے اپنا نام تک بدل لیا لیکن نائن الیون کے دھماکوں نے وہاں پر مقیم مسلمانوں کی زندگیوں کو اجیرن بنا دیا۔ اس ڈاکٹر کو وہاں سے نکال دیا گیا اور جب یہ اپنے وطن پاکستان پہنچا تو وہ اپنی پرانی چیزوں کو دیکھ کر پرانی باتوں اور پرانی یادوں کو سوچنے لگتا ہے۔ اس افسانے میں ہمیں ڈاکٹر کا کردار ناسٹلجیائی کردار کے طور پر دکھائی دیتا ہے۔ امریکہ میں ہونے والے دھماکوں کے فوراً بعد ہی اس توصیف نامی ڈاکٹر کو جو اپنا نام بدل کر

طاؤث کے نام سے مشہور ہو چکا تھا۔ اس کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس دوران اس کی بیوی کیتھی اور دونوں بیٹے اس سے ملنے آئے لیکن دونوں بیٹوں کے رویوں سے یہ واضح ہو رہا تھا کہ جیسے انہیں زبردستی ملنے کے لیے لایا گیا ہوں اور توصیف یہ سوچ رہا تھا کہ کاش یہ تینوں اس سے ملنے کے لیے نہ آتے۔ اسی طرح تفتیش کے مراحل سے گزارنے کے بعد توصیف کو ڈی پورٹ کر دیا گیا اور وہ پاکستان میں اپنی بیوہ بہن کے گھر آکر رہنے لگا۔ اتنا وقت گزر جانے کے باوجود توصیف نے جو تصویر انٹر کے زمانے میں بنائی تھی وہ اس کے کمرے کی دیوار پر اسی طرح لٹکی ہوئی تھی وہ اس تصویر کو دیکھ کر اُس وقت کو یاد کرنے لگتا ہے۔ اس حوالے سے افسانے کا اقتباس پیشِ نظر ہے:

"وہ گھبرا کر اس تصویر کے سامنے جا کھڑا ہوا جو اس نے انٹر کا امتحان دے چکنے کے بعد فراغت کے ایسے لمحات میں بنائی تھی۔۔۔اسے یاد آیا جب وہ یہ تصویر بنا رہا تھا تو اس نے اپنے باپ سے کہا تھا، کاش کبھی وہ دنیا کی حسین ترین تصویر بنا پایائے۔ اس کے باپ نے اس کی سمت محبت سے دیکھ کر کہا تھا، تم بنا رہے ہو نا، اس لیے میرے نزدیک تو یہی دنیا کی خوبصورت ترین تصویر ہے۔۔۔ وہ ہنس دیا تھا، تصویر دیکھ کر اور وہ جملہ سن کر۔"[١٧]

توصیف اس تصویر کو مکمل نہیں کر سکا لیکن اس کے باپ کو وہ تصویر بہت عزیز تھی۔ اسی لیے اس نے بیٹے کی ادھوری تصویر کو محبت سے دیوار پر لٹکا دیا۔ جو اس کی بہن نے ہمیشہ دیوار پر لٹکی رہنے دی۔ توصیف طویل عرصے بعد پاکستان آیا تھا اور اس تصویر کو لٹکا ہوا دیکھ کر بیتے ہوئے لمحوں کی یاد میں کھو گیا۔ یہ پورا افسانہ نائن الیون کے بعد امریکہ میں مقیم پاکستانی کی زندگی کی کہانی ہے جو امریکن عورت سے شادی کر لیتا ہے۔ اس کے دو بیٹے ہیں اور جب اس توصیف نامی ڈاکٹر کو ملک بدر کیا گیا تو اس کے بیوی بچوں کی یہی خواہش تھی کہ وہ جانے سے پہلے اپنی جائیداد ان سب کے نام منتقل کر دے۔ افسانے کے اس حصے میں ہمیں رشتوں کی توڑ پھوڑ کے ساتھ ساتھ بے حسی بھی دکھائی دیتی ہے۔

افسانہ "کیس ہسٹری سے باہر قتل" میں مصنف نے اکیسوی صدی میں ٹیکنالوجی کے سبب ہونے والی بے حسی اور رشتوں میں دوری کے حوالے سے بہت خوبصورتی سے لکھا ہے۔ دو ڈاکٹر میاں بیوی انہوں نے

اپنی زندگی کو پُر آسائش بنانے کے لئے جو بھی منصوبے بنائے۔ان سب چیزوں کے حصول کے لیے انہوں نے بہت محنت کی، کہ ایک دوسرے کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔زندگی بہت مصروف سے مصروف تَر ہوتی جارہی تھی۔اس کہانی کے ساتھ ڈاکٹر نوشین کی ایک دوست کی کہانی بیان کی گئی ہے۔جو گھر کے کام میں اس قدر مصروف رہتی تھی کہ اس کے پاس خود کو دینے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ ہر کام وقت پر کرنے کی عادی تھی اسی لیے ایک روز اس کی آنکھ لگ گئی اور کھانا بنانے میں دیر ہوگئی۔تو اس کے ساتھ ہی وہ دروازہ بھی وقت پر نہ کھول سکی۔اس چند منٹوں کی تاخیر کی وجہ سے اس کے شوہر کی دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے موت ہو گئی اور وہ خود کو اس کی موت کا ذمہ دار سمجھ رہی تھی۔کیونکہ کھانا بناتے ہوئے اس کی نظر اپنے بازو پر پڑی اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی ہڈیوں نے اس کے گوشت کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔اب اپنے شوہر کی وفات کے بعد وہ خود ہی ایک سرے کو کہانی کے دوسرے سرے سے جوڑتی رہتی ہے:

"۔۔۔اس کی نظر کو ہڈیاں چھوڑنے والے گوشت نے جکڑا ہوا تھا۔اس کے بعد وہ نہیں جانتی کہ انور نے کتنی بار ایکسی لیٹر پر پاؤں کا بوجھ بڑھایا تھا۔۔۔۔۔۔اس نے اسے کبھی اتنا انتظار کرنے ہی نہ دیا تھا۔انور نے ہارن نہ بجایا ہو گا لیکن اس کا دل وسوسوں سے بھر کر زور زور سے ضرور بجنے لگا ہو گا۔"[۱۸]

حمید شاہد نے افسانہ "کِلی کلیر دی" جیسا کہ موضوع سے ظاہر ہے۔ماضی کے اس کھیل کے بارے میں بیان کیا ہے۔جو پہلے تقریباً ہر لمحہ ہی اپنے بچپن سے اس کھیل سے واقف ہوتا تھا مگر دورِ حاضر میں بچوں کو اس قدر مصروف کر دیا گیا ہے کہ ان کے پاس کھیلنے کا بھی وقت نہیں ہے۔ادیب کہانی کے موضوع کے بارے میں ایک ناقد سے مشورہ کرتے ہیں تو وہ انہیں کہتی ہے کہ اس کھیل کے دورِ جدید کا بچہ واقف نہیں ہے تو ایسا موضوع کس کام کا ہو گا تو ادیب کو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ واضع دورِ حاضر میں بچوں کو اسکول کے بعد ٹویشن اور دیگر مصروفیات کے سبب کھیلنے کا وقت نہیں ملتا ہے۔وہ خود بھی کِلی لفظ کو سن کر ماضی کی یادوں میں کھو جاتا ہے۔اس کی مثال افسانے میں کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے:

"اس کی آنکھیں ماضی کی یادوں تلے بند ہونے لگیں اور ہونٹ میٹھے لفظوں کی لذت کو چاٹنے لگے:

ککلی کلیر دی

پگ میرے ویر دی

۔۔۔۔ہاں! یہی تو اس لفظ کی خوبی تھی کہ بچھڑے بچپن کی انگلی تھما دیتا تھا۔"[۱۹]

اسی طرح اس افسانے میں برقی ترقی کی بدولت ہونے والی انسانی زندگی میں مصروفیت اور آسانیوں کے ساتھ ساتھ انسانی رشتوں میں دوری کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ اس سے سوال کرتی ہے کہ اس نے آخری بار اپنے بچوں کا چہرہ کب دیکھا تھا، تو وہ گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے کیونکہ اسے یاد ہی نہیں آرہا ہوتا کہ اس نے کب اپنے بچوں کو دیکھا تھا، کیونکہ وہ اس قدر مصروفیت سے دوچار ہے کہ کسی کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔ اس تیز رفتار زندگی میں نہ ہی بچوں کے پاس کھیلنے کا وقت ہے، نہ ہی اس مصروف دور میں کھیل کود کے بغیر بچوں کا کوئی بچپن ہے۔ کیونکہ جو کھیل پہلے کی نسل کھیلتی تھی نئی نسل ان کھیلوں سے واقف ہی نہیں ہے۔

"ٹیوشن، ہوم ورک،۔۔۔۔ انٹرنیٹ اور لمبے دن کی بے پناہ تھکن۔ معصوم چہروں کو بے ڈھب معلومات کے اس عفریت نے نچوڑ کر بوڑھا کر دیا ہے۔ اتنی تیزی سے گزرتے ہوئے طویل دن کی کوئی شام ان کھیلوں کے لئے نہیں ہے۔ جو ساری عمر انگلی تھامے رکھ سکتے ہیں۔۔۔۔ نہ ککلی۔ جب بچوں کے پاس بچپن ہی نہیں رہا تو پھر ککلی کیسی؟"[۲۰]

محمد حمید شاہد افسانہ "آدمی کا بکھراؤ" میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کرتا ہے جو ہسپتال کے سی سی یو میں موجود ہے۔ کامران بظاہر ہسپتال کے بیڈ پر لیٹا ہوا ہے لیکن وہ اپنے باطن کے ذریعے کراچی کی سیاسی صورتحال اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال کو دیکھ رہا ہے۔ ہر طرف کنٹینر لگے ہوئے ہیں۔ بے شمار لوگوں پر گولیاں برسا کر لاشوں کے انبار لگائے جا رہے تھے۔ ہر طرف خوف و ہراس کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ کامران اپنے کمرے میں موجود ٹی وی اسکرین پر ان تمام مناظر کو دیکھ چکا تھا۔ اب وہی تمام مناظر وہ بیڈ پر لیٹے ہوئے سوچ رہا تھا۔ کامران کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سب مرنے والے پہلے سے مرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ ہر طرف سڑکوں پر لوگ کھڑے نعرے بازی کرنے کے لیے جمع تھے۔ ہر طرف افراتفری اور

انتشار کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ ان سب مناظر کو وہاں پر موجود پولیس بھی دیکھ رہی تھی لیکن وہ گولیاں برساتے ہوئے لوگوں کو روکنے میں ناکام نظر آرہی تھی کامران ان مناظر کو اس طرح سوچ رہا تھا:

"لوگ مسلسل کنٹینر کے نیچے یوں گھسے چلے آتے تھے جیسے انھیں پیچھے سے دھکیلا جارہا تھا۔ اس نے بے بسی سے ایک بار پھر چورس شگاف میں دیکھا، وہاں سڑک کے درمیان دور تک کچلی ہوئی لاشیں بچھی تھیں۔"[۲۱]

اس افسانے میں کامران کا کردار ماضی کے واقعات کے بارے میں سوچتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی طبیعت ناساز ہونے کے باوجود وہ اپنے حال، اپنی صحت کے لئے فکر مند نہیں تھا بلکہ ایسی تشویشناک حالت میں بھی وہ ان واقعات کو یاد کر رہا ہوتا ہے۔ جن کو یا تو وہ ٹی وی پر نشر ہوتے دیکھ چکا تھا یا پھر وہ خود ان واقعات کا عینی شاہد تھا۔ کامران اس بیڈ پر لیٹے ہوئے یہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ یہ اس کا گھر نہیں ہے بلکہ وہ اسپتال میں موجود ہے تو پھر وہ اپنے دن بھر کے کاموں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ آخر کیا ہوا تھا۔ دراصل وہ ٹیکسلا یونیورسٹی میں منعقد ہونے والی تقریب میں شامل تھا۔ وہیں پر اسے معلوم ہوا کہ ایک عدالتی چیف کی کراچی آمد سے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی تو بے شمار لوگوں کو اپنی جانیں قربان کرنا پڑیں۔ کامران فوراً ہی وہاں سے نکلا کہ وہ گھر پہنچ جائے لیکن راستے میں وہ لوگوں کے ہجوم میں پھنس گیا جہاں اس کے گردن میں گولی لگنے کے سبب وہ زخمی ہو گیا تھا اور اب ہسپتال کے سی سی یو میں موجود تھا۔ اس حوالے سے افسانے کا اقتباس ملاحظہ کریں:

"وہ ایک بار پھر اپنے وجود کو یوں دیکھ رہا تھا جیسا کہ وہ محض ایک لاش تھا۔۔۔ اس کی سوچ بہک رہی تھی لہذا اس نے دھیان کے بکھراؤ کو سمیٹنے کے لیے اپنے دن بھر کی مصروفیات کو ایک ترتیب میں لانا چاہا۔۔۔ ٹیکسلا یونیورسٹی میں ایک تقریب تھی وہ وہاں گیا تھا۔۔۔ یہ پیغام پڑھنے کے بعد وہ وہاں نہیں ٹھہر سکا تھا۔"[۲۲]

افسانہ "تھوتھن بھنورا" میں ایک ایسے شخص کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ جو حصول معاش کے لئے بیرون ملک ہجرت کر کے چلا جاتا ہے۔ پھر ابتدائی تین سالوں تک اپنی بیوی اور بیٹی سے رابطے میں رہتا ہے اور خط و کتابت کے ساتھ ساتھ وہ ان کے لئے پیسے بھی بھیجتا رہا تھا۔ پھر اس نے گرین کارڈ کے حصول کے لئے

شادی کر لی اور پاکستان میں مقیم بیوی بیٹی سے رابطہ ہمیشہ کے لئے منقطع کر دیا۔ اس کی بیوی اس کی یادوں میں کھوئی رہتی تھی۔ وہ ایک خود بر سرِ روزگار ہونے کے سبب اپنی اور اپنی بیٹی کی ضروریات زندگی کو آسانی سے پوری کر رہی تھی لیکن شوہر کی بے وفائی نے ان دونوں کی زندگیوں کو اندھیرے میں بھر دیا تھا۔ اگر ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو موجودہ دور میں روزگار کے لیے دوسرے ملکوں میں جانے کا رواج ہی نکل پڑا ہے۔ جیسے دیکھو وہ بیرون ملک ہجرت کے لیے تیار بیٹھا ہوا ہے۔ لیکن یہ نقل مکانی نہ صرف اس شخص کو دوسری جگہ پر جا کر سکونت اختیار کرنے کی وجہ سے مشکلات سے دوچار کرتی ہے بلکہ اس کے پیچھے رہ جانے والے بیوی بچوں کو بھی بہت سے مسائل تحفے میں دے دیتی ہے۔ اسی طرح رشتوں میں دوری اور بے حسی جیسے مسائل پروان چڑھنے لگتے ہیں۔ اس افسانے میں ان دونوں ماں بیٹی کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تارا کی ماں تنہائی سے خود کو بچانے کے لیے تارا کی شادی کے لیے آنے والی رشتوں سے انکار کرتی رہتی ہے اور پھر اس کی شادی ایک بوڑھے شخص سے کر دیتی ہے۔ اس افسانے میں ماں کا کردار ماضی کی یادوں میں جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس حوالے سے افسانے کی اقتباس کی مثال دیکھیں:

> "تب، کہ جب میں چھوٹی سی تھی اور ہفتے بھر بعد چھٹی والا دن آتا تھا تو بھی مجھے یوں دیر تک بستر پر پڑے رہنا اچھا لگتا تھا۔ ماں حسبِ عادت ایک مقررہ وقت پر دھیمی اور رسیلی آواز لڑھکا کر اپنے کام میں جُت جاتی اور میں دیر تک ایک خواب کی سی کیفیت میں پڑی رہتی۔"[۲۳]

محمد حمید شاہد کے ان افسانوں کے علاوہ خونی لام ہوا قتل عام بچوں کا، کوئٹہ میں کچلاک، جنگ میں محبت کی تصویر نہیں بنتی اور موت منڈی میں اکیلی موت کا قصہ وغیرہ میں بھی ناسٹلجیا کا اظہار ملتا ہے۔ اکیسویں صدی کا آغاز ہی نائن الیون جیسے واقعے سے ہوا تھا۔ یہ واقعہ رونما تو امریکہ میں ہوا لیکن اس کے اثرات نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس واقعہ کے زیادہ تر اثرات پاکستان پر پڑے جہاں آئے دن ہونے والے دھماکوں کی وجہ سے لوگ اپنے حال سے فرار حاصل کر کے سکون کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ اس خوف، ڈر کے نتیجے میں انسان اپنے ماضی میں پناہ لیتا ہوا ہمیں حمید شاہد کے افسانوں میں دکھائی دیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ منشایاد، بحوالہ محمد حمید شاہد، جنم جہنم، استعارہ، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء ص ۱۰

۲۔ محمد حمید شاہد، مرگ زار، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۲۳

۳۔ ایضاً، ص ۲۰

۴۔ ایضاً، ص ۴۰ تا ۴۱

۵۔ ایضاً، ص ۴۵

۶۔ ایضاً، ص ۵۸

۷۔ ایضاً، ص ۷۰

۸۔ ایضاً، ص ۷۴

۹۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۲۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۳۰

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۵۰

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۵۱

۱۴۔ احمد حمید شاہد، آدمی، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء، ص ۱۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۰، ۳۱

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۳

۱۷۔ محمد حمید شاہد، مرگ زار، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۸۰

۱۸۔ احمد حمید شاہد، آدمی، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء، ص ۵۴،۵۵

۱۹۔ ایضاً، ص ۶۷ ۶۸

۲۰۔ ایضاً، ص

۲۱۔ ایضاً، ص ۷۵

۲۲۔ ایضاً، ص ۷۶

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۱۲

باب چہارم

محمد عاصم بٹ کے افسانوں میں ناسٹلجیائی رجحان کا مطالعہ

الف۔ یاد ماضی اور ہجرت کے تناظر میں

دورِ حاضر میں محمد عاصم بٹ کا شمار نمایاں ادیبوں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے نہ صرف افسانہ نگاری کے حوالے سے شہرت حاصل کی بلکہ بطور مترجم، مدیر نقاد اور ناول نگار بھی ادبی حلقوں میں اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ لاہور میں ۱۹۶۶ء میں پیدا ہوئے اپنے تعلیمی سفر کو ۱۹۹۰ء میں فلاسفی میں ایم اے کرنے کے بعد پایہ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ ان کے ادبی سفر کا جائزہ لیا جائے تو انہوں نے اپنا پہلا افسانہ ایم اے کی ڈگری کے دوران لکھا تھا۔ "ماہ نو" کی مدیر کشور ناہید نے اس افسانے پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ پھر وہ کافکا کی کہانیوں کے تراجم کرنے کی طرف راغب ہوئے۔ لاہور سے ملازمت کر کے اسلام آباد آ گئے۔ پھر یہاں سے راولپنڈی اور پھر دوبارہ راولپنڈی سے اسلام آباد نقل مکانی کی۔ اندرون ملک نقل مکانی کا سلسلہ بھی ان کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔

ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "اشتہار آدمی اور دوسری کہانیاں" لاہور سے ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔ پھر ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ۲۰۰۹ء میں اسلام آباد اور راولپنڈی میں لکھی گئی کہانیوں پر مشتمل "دستک" کے عنوان سے کراچی میں شائع ہوا تھا۔

ان کی ان دو افسانوی مجموعوں کا جائزہ لیں تو وہ ہمیں دور جدید کے فرد کے مسائل کو بیان کرتے ہوئے ان حقائق کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ جن کی بدولت اس کی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر رشید امجد کا کہنا ہے:

> "عاصم بٹ اس نسل کا نمائندہ ہے چنانچہ جب وہ اپنے آس پاس پر غور کرتا ہے تو اس کے نتائج اور رویے پرانے فکری رویوں اور نتائج سے مختلف ہوتے ہیں۔ ہونا بھی چاہیے اس

نے اپنی مختلف رویوں پر اپنی کہانیوں کی عمارت استوار کی ہے اور یہی ان کہانیوں کی جدت اور انفرادیت ہے"[1]

وہ فرد اور سماج میں پیدا ہونے والے مسائل کو بیان کرنے میں عبور رکھتے ہیں۔ اس سب کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ملکی حالات اور اپنے ارد گرد کے حالات کو بھی فراموش نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنے کرداروں کے ذریعے ان کے نفسیاتی مسائل کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ہجوم میں رہتے ہوئے فرد کی تنہائی کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ناسٹلجیا کا اظہار ہر ادیب کسی نہ کسی طور پر اپنی تحریروں میں کرتا رہتا ہے۔ کوئی ادیب شدت سے اس کا اظہار کرتا ہے، تو کوئی ہلکے پھلکے انداز میں بیان کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

عاصم بٹ کی تحریروں میں جہاں ماضی کا اظہار کرتے ہوئے کردار نظر آتے ہیں تو ان کے کرداروں میں خواب بھی بطور استعارہ نظر آتا ہے۔ انھی خوابوں کے ذریعے وہ اپنے تخیّل میں رہتے ہوئے خارج کو اپنے باطن سے جوڑ پاتے ہیں۔ انسان کبھی بھی اپنے ماضی کو بھول نہیں پاتا، وہ گزرے ہوئے دنوں سے کبھی بھی چشم پوشی اختیار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ماضی انسان کے وجود کا ایک اہم حصہ بن چکا ہوتا ہے۔

محمد عاصم بٹ اپنے افسانے "آخری فیصلہ" میں رشید احمد نامی کردار کی کہانی بیان کرتا ہے جو اپنی زندگی کے مختلف ادوار گزارے ہوئے دنوں کی کہانی لکھ رہا ہے۔ اس افسانے کا یہ کردار ماضی کی یادوں میں پناہ لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک سرکاری ادارے میں بطورِ کلرک ملازمت کر رہا ہے۔ اسے یہاں نوکری کرتے ہوئے پندرہ برس بیت گئے ہیں۔ وہ پندرہ سال بعد بیٹھا ہوا اس ملازمت کے بارے میں لکھ رہا ہے کہ جب اس نے گریجویشن کیا تو اس ملازمت کے لئے ایف اے والے شخص کی ضرورت تھی جبکہ اس نے گریجویشن کیا ہوا تھا۔ اس نے اس نوکری کے لیے درخواست دی تو اس کی تقرری ہو گی۔ لیکن وہ اس ملازمت سے خوش نہیں تھا۔ وہ اپنے کالج کے دور کے بارے میں سوچتا ہے کہ تو مصور بننا چاہتا تھا لیکن مالی وسائل کم ہونے کے سبب اس شوق کو پورا نہ کر سکا۔ دراصل یہ خط رشید احمد نے خودکشی سے پہلے لکھا تھا کیونکہ وہ اپنے حالات کی تلخیوں سے بہت مایوس ہو چکا تھا۔ اسی مایوسی سے نجات کے لیے وہ مرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے وہ اس خط میں اپنی

زندگی کے تمام تر حصوں کو آشکار کرتا ہے۔ وہ مرنے کا فیصلہ اپنے مالی وسائل کی کمی کے سبب کرتا ہے اسی کے سبب ہی اس کی بہت سی خواہشات ادھوری رہ گئی۔ اس حوالے سے افسانے کا اقتباس پیش نظر ہے:

"مجھے تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ مصور بننا چاہتا تھا۔ ڈرائنگ میں ہمیشہ میرے نمبر اچھے ہوتے۔ ایف اے میں فائن آرٹس کا مضمون صرف اسی نیت سے رکھا کہ آگے کسی آرٹس کالج میں داخلہ لوں گا۔ لیکن اس پر کتنا خرچہ اٹھے گا اس کا اندازہ مجھے تبھی ہو گیا جب ایف اے میں فائن آرٹس کے پریکٹیکل کے لیے ادھار مانگ کر قیمتی رنگ، برش اور کینوس وغیرہ خریدے۔"[۲]

یوں تو ہر ادیب ہی اپنی تحریروں میں کسی نہ کسی انداز میں ناسٹلجیا کو بیان کرتا ہے۔ عاصم بٹ دورِ جدید کے انسان کی ذہنی و نفسیاتی کشمکش اور اس کے مسائل کو بیان کرنے پر قادر نظر آتے ہیں۔ یہ کردار اپنے حالات زندگی سے بہت زیادہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ وہ پندرہ برس پہلے کلرک بھرتی ہوا تھا، اگلے درجے پر جانے کے لیے اس نے بہت سی درخواستیں دیں لیکن اس کی کوئی سنوائی نہیں ہوئی۔ وہ اپنی زندگی کے تمام تر مسائل سے چھٹکارا پانے کے لیے خودکشی کرنے کی منصوبہ سازی کر رہا ہوتا ہے تو اس وقت بھی اسے ماضی میں رونما ہونے والا ایک بچہ کی موت کا واقعہ یاد آتا ہے۔ اس واقعے کو افسانے میں کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"بہت عرصہ پہلے ہماری گلی میں ایک بارہ برس کا بچہ تین منزلہ مکان کی چھت سے نیچے گلی میں گر گیا تھا۔ میں نے ہی جا کر اسے گود میں اٹھایا۔ وہ ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔ جیسے اسے ٹھنڈ لگ رہی ہو۔ میں نے اس کی آنکھوں میں موت کی سفیدی اترتے دیکھی اور میرے سامنے بلکہ میرے ہاتھوں میں اس نے دم توڑ دیا۔"[۳]

رشید کی موت ایک حادثے کی وجہ سے ہوئی اس کا خط اس کے بٹوے میں ہونے کے باعث سڑک پر سامان اکٹھا کرنے والوں میں سے ایک چشم دید گواہ نے بارہ سال تک سنبھال کر رکھا۔ وہ ایک ادیب تھا۔ اس نے یہ خط رشید کی بیوہ کے منع کرنے کے سبب کسی کو نہ دکھایا، اب بارہ سال بعد اس کی بیوہ کے وفات پانے کے

بعد اس ادیب نے اس خط کو چھپوا دیا کیونکہ وہ خود بھی رشید کی طرح زندگی کی الجھنوں سے نجات پانے کے لیے آخری فیصلہ کر چکا تھا۔

اسی طرح افسانہ "عہد گزشتہ کی ایک کہانی" میں ادیب نے گیارہ ستمبر کو ہونے والے واقعے کے بعد بدلتی ہوئی عالمی صورتحال کو بیان کیا ہے کہ کس طرح سے ایک واقعہ نے پوری دنیا کو دیکھتے ہی دیکھتے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ افسانہ نگار نے افسانے میں اس واقعہ کے بعد پوری دنیا پر ایسی تاریکی چھائی ہوئی دکھائی ہے کہ ایک اتنی طویل رات ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی سورج طلوع ہونا بھول چکا ہے۔ اسی طرح ہر طرف چوہے ہی چوہے پھر رہے ہیں جو لوگوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ سب لوگ بے یقینی اور خوف میں مبتلا دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کہانی کا مرکزی کردار رات کو دیر سے آنے کے بعد سو جاتا ہے۔ اس کی آنکھ جب کھلتی ہے تو ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا دیکھ کر وہ گھڑی کو دیکھتا ہے۔ اسی دوران وہ کمرے میں چوہوں کی سرسراہٹ محسوس کرتا ہے۔ وہ اٹھ کر کمرے کا جائزہ لیتا ہے تو چوہا اس کے پاؤں کے ناخن پر کاٹ لیتا ہے۔ وہ پھر سوچنے لگتا ہے کہ آخر یہ چوہا کہاں سے آیا اور پھر اسے یاد آتا ہے۔

> "سال بھر پہلے کمرے میں سامان کی ترتیب بدلتے ہوئے اس نے اس کا اچھی طرح معائنہ کیا تھا۔ اسے یاد تھا بستر کے سرہانے کے برابر دیوار میں البتہ ایک سوراخ تھا لیکن جو اتنا تنگ تھا کہ اس کے دہانے میں اس کی چھنگلی بھی داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ جیسے دو اینٹوں کے درمیان سیمنٹ کی چپٹی اکھڑنے سے خلا بنا ہو۔"[۴]

اس افسانے کے عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ماضی کا قصہ ہے۔ اسی طرح افسانے کا مرکزی کردار اپنے زخم کو دیکھ کر بہت پریشان ہوا اور اس دوران وہ اپنے بچپن کے بارے میں سوچنے لگا۔ نائن الیون کے اس ایک واقعے نے ساری عالمی صورتحال کو متاثر کیا جس سے آئے روز بے شمار لوگوں کو موت کے گھاٹ اترنا پڑا۔ اسی لیے معاشرے میں خوف اور بے یقینی کی فضا چھا گئی۔ ٹی وی اسکرین پر بھی ہر روز اسی طرح کی دلخراش خبریں نشر ہونے لگی۔ ان تمام تر حالات نے انسانی نفسیات کو بری طرح متاثر کیا۔ لوگ ان تمام تر حالات سے پریشان ہو کر لوگ بیتے ہوئے دنوں کی خوشگوار یادوں میں پناہ لینے لگے۔ جو لوگ گھروں

سے حصولِ معاش اور دیگر کاموں کے لیے نکلتے تھے ان کو اس حوالے سے لایقینی کا شکار تھے کہ نہ جانے وہ گھر لوٹ کر پائے گے یا نہیں۔ اسی لیے زیادہ تر لوگ ناسٹلجیا کا شکار ہو گئے۔ اس حوالے سے افسانے میں وہ اپنے بچپن کے بارے میں سوچ رہا ہو تا ہے:

"وہ سوچنے لگا، بچپن میں اسے جانوروں سے کتنا انس تھا۔ خونخوار درندوں سے جو کارٹون، فلموں میں انسانوں کی طرح باتیں کرتے اور ناچتے گاتے تھے۔ سبھی اس کے دوست تھے۔۔۔ یہ سب اس کے خوابوں کے بھی ساتھی تھے۔۔۔ لیکن چوہے کبھی اسے ایک آنکھ نا بھائے۔"[۵]

عاصم بٹ کے افسانوں کے کردار ہمیں خارج سے زیادہ باطن سے جنگ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جدید دور میں جہاں زندگی ایک طرف ٹیکنالوجی کی مانگ بڑھنے سے آسائشوں سے ہمکنار ہوئی ہے تو دوسری طرف اس نے فرد کو بہت سے مسائل سے دوچار کر دیا ہے۔ وہ اس آسائشوں کو حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرتا ہے اور خود بھی ذہنی تناؤ کا شکار رہتا ہے۔ اسی قسم کا کردار ہمیں افسانہ "چالیس سال پر محیط ایک لمحہ" میں دکھائی دیتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار 'وہ' ہے جو چالیس سالہ شخص ایک دفتر میں ملازمت کر کے اپنے گھر والوں کی کفالت کرتا ہے۔ اسے کبھی بیوی کو نئے کپڑے دلوانے کی فکر کھائے جاتی ہے تو کبھی بچے کو سائیکل لے کر دینے کی فکر لاحق رہتی ہے۔ اس کے گھر والے اپنی ضروریاتِ زندگی کی چیزوں کے حصول کا تقاضہ کرنے کے لیے ہی اس سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی اس شخص کی بات سننے والا نہیں ہوتا اسی لیے وہ ان تمام معاملات سے بیزار ہو جاتا ہے نہ ہی اس کا دفتر میں دل لگتا ہے اور نہ ہی گھر میں۔ اب اکثر و بیشتر وہ دفتر سے بھی چھٹیاں کرنے لگا ہے۔ اس سے نہ ہی گھر والے خوش ہیں اور نہ ہی دفتر کے لوگ۔ وہ خود بھی ان حالات سے تنگ آکر ایک پارک میں بیٹھ کر وقت گزارنے کو پسند کرتا ہے۔ جب وہ دفتر سے چھٹی کرتا ہے تو پورا دن اِدھر اُدھر گھوم پھر کر ہی وقت گزارتا ہے۔ ایک روز وہ ایسے ہی وقت گزاری کے لیے وہاں بیٹھا ہوا تھا تو اسے پاس بیٹھا ہوا بچہ دکھائی دیا، وہ اس سے اس کے بارے میں پوچھتا ہے اور پھر دوسری طرف ایک بچے کو گیس کے غبارے سے کھیلتے دیکھ کر وہ اپنے بچپن کے دنوں کو سوچنے لگتا ہے۔

افسانے کا مرکزی کردار ناسٹلجیائی کردار کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے وہ اپنے حال کی تلخیوں اور الجھنوں سے نجات پانے کے لیے وہ بیتے دنوں کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ اس حوالے سے اقتباس پیش نظر ہے:

> "اسے اپنا بچپن یاد آ رہا تھا۔ اس نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ چالیس سال کے بعد انسان میں دانش ورود ہوتا ہے۔ وہ دانا بن جاتا ہے۔ اس نے سوچا کیا دانش اور بچپن کا آپس میں کوئی تعلق ہے؟ دانش کی عمر میں بچپن یاد آنے کا کیا معنی؟۔۔۔۔"[٦]

وہ ہر روز دفتر سے واپسی پر پارک میں بیٹھ جاتا اور وہ بچہ بھی ہر روز وہاں موجود ہوتا۔ وہ اسے اپنے بچپن کے بارے میں بتاتا تو کبھی اس کے ساتھ کھیلتا تھا۔ دراصل وہ جسے بچہ سمجھ رہا ہوتا ہے وہ اصل اس کا بچپن ہی تھا۔ اسے اپنے ماضی میں بچپن کا زمانہ ہی بہت پسند تھا اس لیے زیادہ وقت وہ اسے سوچنے میں ہی صرف کرتا تھا۔ وہ اب عمر کے جس حصے میں تھا اس کے بال بھی اپنی رنگت بدل کر سفیدی مائل ہوتے جا رہے تھے۔ وہ اپنے بالوں کو دیکھ کر بھی اپنے بچپن کو سوچنے لگتا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت اپنے گزرے ہوئے دنوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ گزرا ہوا وقت چاہے اچھا ہو یا برا لیکن حال میں وہ ماضی بھی خوشگوار احساس دیتا ہے۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ کریں:

> "اپنی طرف تیزی سے بڑھتے بڑھاپے کا سوچ کر اسے اپنی گزری ہوئی زندگی، اور خاص طور پر بچپن شدت سے یاد آتا اور پھر یہ خیال اس کی آنکھیں پر نم کر دیتا کہ اس کی عمر کا پیمانہ بس اب لبریز ہونے کو تھا۔ آگے مختصر مستقبل تھا اور پیچھے طویل ماضی، جو بہت سی میٹھی یادوں کے دیوں سے جھلملا رہا تھا۔"[٧]

اس افسانہ کا مرکزی کردار زندگی کی چالیس بہاریں گزارنے کے بعد بھی وہ اپنے بچپن کو دوبارہ جینا چاہتا ہے۔ وہ اپنے موجودہ حالات سے اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے، اسی لیے اسے اپنی نوکری کے چلے جانے سے بھی لاپرواہ ہے وہ افسانے کا ناسٹلجی کردار ہے۔ جب مادی وسائل کے حصول کی خواہش بہت شدت سے پروان چڑھنے لگتی ہے تو ایک انسان بحیثیت فرد کے ان مادی آسائشوں کے درمیان کہیں کھو جاتا ہے تو ایسی صورتحال میں وہ اپنے بچپن کے ان دنوں کو یاد کرتا ہے جب وہ ان مادی چیزوں کے حصول سے بے نیاز

تھا۔ انسان کے پاس یادیں ایک قیمتی اثاثے کی طرح محفوظ ہوتی ہیں۔ ان یادوں میں ہر طرح کی یاد چاہے اچھے دنوں کی ہو یا پھر حالات کی تلخی کے واقعات، یہ سب ذہن میں محفوظ ہوتے رہے ہیں۔ اسی طرح افسانہ "دستک" کا مرکزی کردار 'میں' ہے جو اپنے ماضی کی یادوں میں ہی زندہ رہتا ہے وہ پہلے کے زمانے کو زیادہ اچھا سمجھتا ہے اور معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کی بدولت انسان تنہائی کا شکار ہو گیا ہے یادیں ایک انسان کے پاس ایسے قیمتی خزانے کی طرح ساتھ رہتی ہیں جو انسان کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتیں ہیں۔ یادوں کے حوالے سے اس افسانے میں موجود ایک اقتباس پیش نظر ہے:

> "اپنی یادوں کے گودام میں جھانکتا ہوں تو اتنا کاٹھ کباڑ ہے۔۔۔۔ لیکن بہت سی بے کار یادوں میں ایسے چمکدار، رنگ برنگے، دلچسپ اور تاباں ستارے بھی ہیں جن کی روشنی وہاں کبھی مکمل اندھیرا نہیں ہونے دیتی۔"[۸]

یہ مرکزی کردار زندگی کے اس حصے میں پہنچ گیا ہے جہاں جیتنے کے لیے اس کے پاس صرف یہ یادیں ہی ہیں۔ وہ اپنے بچپن ان دنوں کے بارے میں سوچتا ہے جب وہ اسکول میں پڑھتا تھا۔ ہر روز اسکول سے واپس آنے پر وہ دروازہ کھٹکھٹاتا تھا تو اس کی ماں دروازہ کھول دیتی تھی لیکن جس روز اس کے والد کی وفات ہوئی تو وہ اسکول سے آیا تو گھر کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اور گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ بہت پریشان ہوا کہ اس کی ماں کیوں رو رہی ہے اور یہ سب یہاں کیوں جمع ہوئے ہیں۔ وہاں پر موجود لوگوں میں سے چند ایک اسے اس کی ماں تک جانے نہیں دیتے، اسے پکڑے رکھتے ہیں لیکن وہ ان سے بچتا بچاتا اس کمرے کی طرف لپکتا ہے جہاں اس کی ماں رو رہی تھی۔ اس کے بڑے بھائی کے کندھوں پر تمام تر ذمہ داری کا بوجھ پڑھ جاتا ہے۔ وہ بہن بھائیوں کو پڑھاتا ہے۔ لیکن مرکزی کردار 'میں' کو نہ ہی پڑھائی سے کوئی لگاؤ تھا اور نہ ہی کسی کام کو سیکھنے سے کوئی رغبت تھی۔ اسے صرف پتنگ بازی کا جنون تھا۔ اسی لیے اپنا زیادہ تر وقت اسی کام میں صرف کر دیتا تھا۔ وہ اس وقت کے لوگوں کے پتنگ بازی کے شوق کا موازنہ موجودہ دور کے لوگوں سے کرتے ہوئے سوچتا ہے۔

"لیکن میرا شوق پتنگیں اڑانے کا تھا۔ گڈی گراؤنڈ میں کیا پیچ پڑتے۔ اب تو اس فن کی کوئی وات نہیں پوچھتا۔ تب کی دنیا ہی اور تھی۔"[۹]

افسانہ "دستک" کا جائزہ لیں تو اس کے زیادہ تر واقعات ماضی میں رونما ہوئے یا یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اس افسانے کا مرکزی کردار اپنی زندگی کی روداد سنا رہا ہے۔ وہ گاہے بگاہے اپنے ماضی کے ورق پلٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے یہ ایک ناسٹلجیائی کردار کے طور پر نمایاں ہے جو حال سے زیادہ ماضی کی یادوں میں کھویا رہتا ہے۔ ہمیں کچھ کردار حصول معاش کی غرض سے نقل مکانی کرنے کی صورت میں بھی اپنے ماضی کے دنوں کے حوالے سے سوچتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ محمد عاصم بٹ کے افسانوں میں دور جدید کے بدلتے تناظر میں کردار ماضی کی خوشگوار یادوں میں سانس لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ب۔ سماجی اور نفسیاتی تناظر میں

محمد عاصم بٹ کے افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں ان کے کردار اپنی نفسیات سے جنگ لڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ کافی حد تک اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہمیں نفسیات سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انسان جس معاشرے میں اپنی زندگی کے شب و روز بسر کرتا ہے۔ اس معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیاں اُس فرد کی نفسیات پر بھی گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے کرداروں کا ناسٹلجیائی تناظر میں مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کے کرداروں کے حوالے آمنہ مفتی کا کہنا ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو بہت گہرائی سے جانتے ہیں کہ ان کی تکلیفوں اور دکھوں کو اور پھر اس اکے سبب جو زخم ان کو ملتے ہیں، وہ ان سب سے واقف ہیں۔

عاصم بٹ نے افسانہ "دائرہ" میں ایک ایسے ناسٹلجیائی کردار کے ذریعے کہانی کو بیان کیا ہے جو اپنے حال سے زیادہ ماضی کے واقعات میں زندہ رہنے کو پسند کرتا ہے۔ اس کے اس دنیا میں آتے ہی اس کی ماں اس دنیا سے رخصت ہو گئی یوں اس کے باپ نے تنہا اسے پالا۔ اس کا والد جوردی کا لین دین کرتا تھا۔ جس سے ضروریاتِ زندگی پوری ہو جاتی۔ اس کے گھر میں بھی کوئی خاطر خواہ سامان نہیں تھا صرف گھر کے صحن میں نیم کا درخت تھا اور باورچی خانے میں ضرورت کے برتن تھے۔ اور اس کے والد کی کرسی جس پر اکثر وہ بیٹھا رہتا

تھا۔ یہ کرسی اس کی پسندیدہ تھی۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت اس ردی کے ڈھیر میں سے صفحات پر لکھی تحریریں پڑھنے میں گزرتا تھا۔ وہ اپنے باپ کی وفات کے بعد بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ یہ تنہائی اسے بار بار اپنے باپ کے ساتھ گزارے وقت کو یاد کرنے کی طرف دھکیل دیتی تھی، وہ اپنے باپ کی زندگی اس کی دن بھر کی مصروفیت کے بارے میں سوچتا ہے:

"جو کام اپنے ابا کے مجھے یاد ہیں یعنی جو کام اس نے میرے ہوش سنبھالنے سے لے کر خاموشی سے آنے والی اپنی موت تک کیے، ان میں سے ایک تو ردی خریدنے اور بیچنے کا تھا۔ کتابیں، اخبار کے پھٹے ہوئے صفحے، مصنوعات کے ریپر۔۔۔ کاغذ کے رموں کی کٹائی سے بچنے والی کترنیں اور نجانے کیا کیا۔ الم غلم خریدنے کا اسے شوق تھا۔"[۱۰]

اس افسانے میں وہ اپنے باپ کے بارے میں سوچنے کے ساتھ وہ اپنی ہمسائی صغراں آپا کے بارے میں بھی سوچتا رہتا تھا۔ وہ کھانا کھانے زیادہ تر اس ہمسائی کے گھر جاتا تھا کیونکہ اس کا والد خود بھی کھانا باہر سے کھاتا اور اس کے لیے بھی باہر کا کھانا لاتا تھا جو اسے اچھا نہ لگتا تھا۔ اس لیے اپنے باپ کے گھر لوٹنے سے پہلے ہی وہ صغراں کے گھر سے کھانا کھالیا کرتا تھا۔ لیکن باپ کی وفات کے بعد وہ کبھی کبھار کھانا کھانے جاتا اور پھر اسی طرح طویل عرصے کے بعد اس نے آپا کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اسے یہ خبر ملی کہ صغراں آپا کئی روز پہلے وفات پا گئی تھی۔ ان تمام واقعات نے اسے ذہنی طور پر بہت متاثر کیا اور ایک روز اس پر بہتان لگا کر اس علاقے سے نکال دیا گیا۔ اس وقت بھی وہ سوچ رہا ہوتا ہے:

"لیکن میرے ابا کو بستی سے نکالے جانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے اس بستی کو آباد کیا تھا۔ بلکہ شاید وہ پہلا فرد تھا جو اس بستی میں داخل ہوا۔ لیکن مجھے کوئی رعایت دینے کی ان کی کوئی مجبوری نہیں تھی۔"[۱۱]

اس افسانے میں ہمیں سماجی عناصر بھی اسے ماضی کی طرف دیکھنے، اسے سوچنے پر مجبور کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات مثلاً اپنے والدین کے اس دنیا سے چلے جانے اور پھر صغراں آپا کا اس دنیا سے چلے جانا، یہ تمام واقعات ہی اسے نفسیاتی طور پر متاثر کرتے ہیں۔ وہ پہلے بھی گھر میں

زیادہ تر وقت اکیلے ہی گزارتا تھا کیونکہ اس کا باپ تلاش معاش کی خاطر گھر سے چلا جاتا تھا۔ وہ اس بستی میں ایک طویل عرصے سے رہ رہا تھا لیکن وہاں پر رہتے ہوئے وہ اجنبیت میں مبتلا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اس کو بستی سے نکالتے ہوئے کسی نے اس پر رحم نہ کھایا۔ نہ ہی اسے اپنا ضروری سامان لینے کا موقع دیا گیا۔ بستی چھوڑنے کے بعد وہ زیادہ عرصہ ایک طویل مسافت میں گزارنے کے بعد جب وہ بہت آگے بڑھ جاتا ہے تو پھر بھی اپنی بستی کی یادوں میں کھویا رہتا ہے۔

اس طرح افسانہ "گڑھے کھودنے والا" میں ایک ایسے شخص کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے جو دن بھر بنجر زمین پر دس گڑھے کھودتا اور دن ڈھلنے سے پہلے ان کو بھرتا ہے۔ وہ واپسی پر بہت تھکن سے چور ہو کر نیند کی گولیاں کھا کر سوتا ہے لیکن اس کی آنکھ سر درد کی شدت کی وجہ سے کھل جاتی ہے۔ وہ اپنا علاج کروانے کی غرض سے بہت سے ڈاکٹروں سے بھی رجوع کر چکا تھا لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا بلکہ اس درد میں مزید اضاف ہوتا جا رہا ہے۔ اسی طرح وہ تنگ آ کر اس حوالے سے سوچتا ہے کہ اسے یہ درد کب سے لاحق ہوا ہے تو اسے وہ دن یاد آیا جب وہ سکول جاتا تھا۔ تو سکول کے زمانے میں ہی اسے یہ درد ہوا تو اس کے والدین نے ڈاکٹر سے معائنہ کروایا تو پتہ چلا کہ اس کی بینائی تو بالکل ٹھیک ہے۔ نیز ڈاکٹر کسی نتیجے پر نہ پہنچ کہ اسے یہ درد کیوں ہوتا ہے۔ اس طرح ہمیں افسانے کا یہ مرکزی کردار نفسیاتی مسائل کا شکار یار نظر آتا ہے۔ وہ ماضی کے بارے میں سوچ کر اپنے اس مرض کی وجوہات تلاش کرتا ہے لیکن کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں لگتا۔ افسانے کا اقتباس اس حوالے سے ملاحظہ کریں:

> "اسے یاد تھا بہت چھوٹی عمر میں جب وہ گلے میں بستہ ڈال کر اور ہاتھ میں تختی لیے اسکول جایا کرتا تھا، تب اس درد سے آشنا ہوا تھا۔۔۔ لیکن ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد اس کی آنکھوں کو مکمل صحت مند قرار دیا۔ تب یہ درد اس شدت سے بیدار نہیں ہوا تھا، جیسا یہ اب تھا حتی کہ جوانی میں بھی اس کی شدت کم نہ تھی۔۔۔"[۱۲]

پھر وہ یونہی اپنی بیماری کے حوالے سے پریشان ہو کر سوچتا ہے کہ اس کے بھائیوں نے اس پر زمین کے لالچ میں جادو وغیرہ کروا دیا ہے۔ اسی لیے وہ اپنے طور پر ہی ان سے تعلق ختم کر لیتا ہے اور شہر میں

ملازمت شروع کر دیتا ہے۔ اسی دوران اس کے بھائی کی موت کی خبر ملتی ہے۔ وہ اس میں بھی شرکت نہیں کرتا تو تینوں بھائی بھی اس سے تعلق ختم کر دیتے ہیں۔ وہ سوچ سوچ کر خود کو تھکا رہا ہوتا ہے کہ کیسے اپنے بھائیوں سے کہے کہ وہ اپنی جائیداد میں سے حصّہ نہیں لوں گا، بس اس جادو کے اثرات کو ختم کر دے۔ اس افسانے میں ہمیں سماجی اور نفسیاتی دونوں محرکات کارفرما نظر آتے ہیں جو اسے ماضی کو سوچنے کی طرف راغب جب کر دیتے ہیں۔ وہ کبھی کسی چیز کو دیکھ کر اس سے وابستہ بات کو سوچنے لگتا ہے۔ کسی چیز کو دیکھ کر ماضی کی بابت کوئی واقعہ یاد آجانا بھی ناسٹلجیا کے ہی زمرے میں آتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ناسٹلجیائی کردار ہیں۔ جو اپنی گزری ہوئی زندگی کے بارے میں ہی سوچتا رہتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے کمرے میں رکھے ہوئے سامان میں پڑی ایک ڈائری کو دیکھتا ہے تو ماضی کے حصّے میں چلا جاتا ہے جب اس نے یہ نوٹ پیڈ خریدا تھا:

> "ایک پیڈ خالی صفحوں کا تھا۔ اس پر کمپنی کے نشان والی کاغذ کی پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ اسے یاد آیا بہت برس پہلے اس نے یہ پیڈ خریدا تھا لیکن اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔"[۱۳]

انسان کسی چیز سے وابستگی کی وجہ سے بھی ناسٹلجیا میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ افسانے کا یہ کردار جو ڈائری پر نگاہ پڑنے کے بعد ماضی کے اس زمانے میں چلا جاتا ہے۔ جب اس نے یہ ڈائری خریدی تھی۔ اسی طرح ایک اور افسانہ "انتظار" جس کا مرکزی کردار 'میں' ایک ناسٹلجیائی کردار ہے۔ وہ اب ملازمت کر رہا ہے۔ لیکن اپنے اسکول، کالج کے زمانے کو یاد کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس افسانے میں سماج کے اس پہلو پر نظر ڈالی گئی ہے کہ لوگ چھتر سائیں کے مزار پر جاکر اپنے مسئلے بیان کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو وہ اس مزار کو دیکھ کر اس کے ابتدائی دنوں کو یاد کرنے لگتا ہے۔

> "مسلم ماڈل اسکول، جہاں میں نے چھٹی جماعت میں داخلہ لیا، اس سے متعلق میری اولین یادوں میں چھتر سائیں سے وابستہ بہت سی یادیں موجود ہیں۔ چھٹی جماعت مجھے اس لیے بھی اچھی طرح یاد ہے کہ اسی زمانے میں میں نے سکول سے بھُٹنے، کے سلسلے کا آغاز کیا۔"[۱۴]

اسی طرح اسکول کی باتیں سوچتے ہوئے اسے یاد آتا ہے کہ اس کے زیادہ تر دوست چھٹی جماعت میں فیل ہوگئے تھے، اس لیے اس کا ساتھ ان دوستوں کے ساتھ زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ وہ چھتر سائیں کے بارے میں سوچ رہا ہوتا ہے کہ وہ ایک نالے کے پاس بیٹھا رہتا تھا اور بچے اسے تنگ کرتے تھے اور پھر ایک فیکا نامی شخص کے آنے کے سبب اس سائیں کے دن پھر گئے۔ فیکا اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ لوگ اپنی فریاد لے کر اس کے پاس آتے تھے تو وہ کچھ اعداد وغیرہ کے ذریعے مسئلے کا حل بتاتا اور لوگوں کے مسائل حل ہو بھی جاتے تھے اور وہ لوگ اتنی نذرونیاز دیتے کہ ایک گندے نالے کے پاس بیٹھے ہوئے شخص کے بیٹھنے کا اچھا بندوبست ہو گیا۔

اس طرح وہ اپنے والد کے بارے میں سوچ رہا ہوتا ہے کہ وہ بھی اکثر و بیشتر اس سائیں کی کرامات کا ذکر کرتا تھا۔ اس کا باپ ایک جواری تھا۔ اس کی ماں کڑھائی سلائی کا کام اور ٹیوشن پڑھا کر گھر کے اخراجات پورے کرتی تھی۔ اس کی ماں کی وفات کے بعد اس کے باپ نے ایک امیر عورت سے شادی کرلی اور ان تینوں بہن، بھائیوں کو بھی اسی عورت کے گھر لے گیا۔ اس عورت کا ان بچوں کے ساتھ ناروا سلوک تھا لیکن یہاں رہنا ان کی مجبوری تھی۔ وہ اپنے بچپن کے بارے میں سوچ رہا ہوتا ہے:

> "میں ساتویں جماعت میں تھا جب میری والدہ کا انتقال ہوا۔ چھوٹا بھائی تیسری یا چوتھی میں ہو گا۔ بہن تین ساڑھے تین سال کی تھی۔ میرے والد نے اسی سال دوسری شادی کرلی تھی۔۔۔۔ ہم ابو کی شادی کے کوئی ایک ڈیڑھ ماہ بعد ہی منتقل ہو گئے۔"[۱۵]

اس افسانے کا مرکزی کردار اپنے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے سارے واقعات کو سوچ رہا ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے پرانے محلے کے پاس سے گزرتا ہے تو وہ حیران ہو جاتا ہے کہ اس کا محلہ کافی حد تک بدل چکا ہے۔ یہاں تک کہ اب اس گندے نالے کے پاس سائیں کا خوبصورت مزار بھی بن چکا ہے۔ وہ اس سب بدلاؤ کے باوجود اس ہجوم میں خود کو تنہا ہی محسوس کرتا ہے۔ اس پُر ہجوم جگہ پر فرد کا وجود زندگی کے مسائل میں کہیں کھو گیا ہے۔ اسی طرح کے تین کردار ہمیں افسانہ 'منتظر' میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں شاعر، صحافی اور گورکن کے کردار اپنی زندگی کی تلخی سے بیزار نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے حالات سے خوش نہیں ہیں، اس بڑھتی

ٹیکنالوجی کی ایجادات کی بدولت جہاں زندگی مصروفیت کے گھیرے میں قید ہوتی جارہی ہے۔ تو دوسری طرف اس کی بدولت ضروریات زندگی کی فہرست بھی طویل سے طویل تر ہو رہی ہے۔ ایسے حالات میں انسان اپنے ماضی کے دنوں کو ہی بہتر سمجھتا ہے۔ جب نہ صرف رشتوں میں اپنائیت کا جوہر شامل تھا بلکہ طرزِ زندگی بھی کافی حد تک سادہ تھا۔

افسانے "تین گبھرو" کی کہانی دورِ حاضر کی ایسی زندگی کی عکاسی کر رہی ہے جو پوری طرح بے حسی اور تنہائی کی مرتکب ہو گئی ہے۔ تین مزدور جو حصولِ معاش کے لیے نقل مکانی کر کے دوسرے شہر آکر آباد ہو گئے۔ وہ ہفتے کے چھ دن خوب محنت سے کام کر کے پیسہ کماتے اور اپنے گھروں کو بھیجتے ہیں لیکن یہ پیسہ اور مادی اشیا ان کے گھر والوں کے لیے اتنی اہم ہو گئی ہیں کہ وہ چھٹی کے دنوں میں بھی انھیں گھر آنے کے لیے نہیں کہتے۔ وہ اس قسم کے حالات میں اپنے ماضی سے اپنا تعلق جوڑ لیتے ہیں۔ وہ کبھی اپنے اس وقت کو یاد کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی ماں کے ساتھ گزارا تھا۔ کبھی وہ اپنے بزرگوں کو اور کبھی خود سے بچھڑنے والوں کو یاد کر کے روتے رہتے ہیں۔ اس حوالے سے افسانے کا اقتباس پیشِ نظر ہے:

> "تینوں گبھرو رات کے اندھیرے میں باغبانپورہ کے چھوٹے سے محلے کے ایک نیم تاریک کمرے میں اپنی چارپائیوں پر بیٹھے اپنے مرے ہوؤں کو یاد کر کے آنسو بہا رہے تھے۔ اسی فطری اور بے ساختہ جذبے کے ساتھ جیسے وہ کسی جلسے میں ہوں اور ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی نعرے لگارہے ہوں۔"[۱۶]

وہ دورِ حاضر میں زیادہ تر اپنے خارج سے زیادہ اپنے باطن خاص طور پر ماضی میں جیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اسی طرح افسانہ "نکڑ" کی نجمہ بھی اپنے گھر کے ماحول اور اپنے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک سے فرار حاصل کرنے کے لیے ناولوں کو پڑھتے ہوئے زندگی کے شب و روز بسر کرتی ہے اور تخیل میں ہی دوسرے علاقوں اور بڑے بڑے بنگلوں کی سیر کر آتی ہے۔

عاصم بٹ کے زیادہ تر افسانوں میں ناسٹلجیا کا اظہار ملتا ہے۔ دور حاضر میں ایک فرد کو جہاں اپنی شناخت کے گم ہونے کا غم ہے تو وہیں اسے اس پُر ہجوم دنیا میں ملنے والی تنہائی کا دکھ بھی نظر آتا ہے۔

محمد عاصم بٹ کے افسانوں کو بحثیت مجموعی پر کھا جائے تو ان کے کردار زیادہ تر ناسٹلجیائی کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ لیکن وہ زیادہ تر کردار ہمیں زیادہ پڑھے لکھے نظر نہیں آتے۔ بلکہ عام سے کردار ہیں جو ایک ہی طرز پر ہی اپنی زندگی کے شب وروز گزار رہے ہوتے ہیں۔ اسی طرزِ زندگی کے حوالے سے معاشرتی مسائل اور اس کی الجھنوں کی عکاسی بھی خوبصورتی سے کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ عاصم بٹ نے دورِ جدید کے فرد کے مسائل کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے کہ وہ کس طرح نفسیاتی الجھن کا شکار ہو کر اپنے حال کی تلخی سے فرار کیلئے ماضی میں پناہ لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ رشید امجد، ڈاکٹر، ماہنامہ "اوراق"، لاہور، مدیر وزیر آغا، ص ۱۰

۲۔ محمد عاصم بٹ، دستک، اے جی پرنٹرز، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵ تا ۱۶

۳۔ ایضاً ص ۲۰

۴۔ ایضاً، ص ۴۸

۵۔ ایضاً، ص ۴۹

۶۔ ایضاً، ص ۶۶

۷۔ ایضاً، ص ۶۹ تا ۷۰

۸۔ ایضاً، ص ۱۶۶

۹۔ ایضاً، ص ۱۶۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۸۲

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۸۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۱۴۔ ایضاً، ص ۷۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۷۵

۱۶۔ یضا ص ۱۶۵

باب پنجم:

مجموعی جائزہ

اکیسویں صدی میں ہونے والی سائنسی ایجادات کی بدولت انسان کو بہت پُر آسائش اور آرام طلب زندگی سے ہمکنار کر دیا لیکن ان ایجادات کے جہاں مثبت اثرات معاشرے پر پڑے تو دوسری طرف ہمیں اس کے منفی اثرات کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس طرح ہتھیاروں اور اسلحے کی ایجاد ملکی دفاع کے پیش نظر کی گئی لیکن اب اسے انسانی جانوں کے ضیاع کا سب سے بڑا سبب تصور کیا جاتا ہے۔ اسی اسلحے کے سامان کو اکیسویں صدی کے آغاز پر نائن الیون کے ہونے والے واقعہ کے بعد دہشت گردی کے خلاف جنگ میں استعمال کیا گیا جس سے لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اترنا پڑا۔ اس صدی کے شروع میں ہونے والے اس ایک واقعہ نے دنیا کی عالمی صورتحال کو پوری طرح بدل کر رکھ دیا۔ اس جنگ کے اثرات نے جہاں پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو سب سے زیادہ مالی و جانی نقصان پاکستان کا ہوا۔ جس سے جہاں بے شمار لوگوں نے اپنی جانیں قربان کیں اور پاکستان میں ہونے والے دھماکوں کے سبب معاشرے میں خوف بے یقینی اور انتشار جیسے عناصر نے جنم لیا۔ ان تمام عناصر نے انسانی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں تخلیق کاروں میں بھی ہمیں ان حالات کا ذکر ملتا ہے اور شخص اپنے حال کی ترقی سے نجات پانے کے لیے اپنے ماضی کے واقعات کو سوچتے ہوئے ان لمحوں کی یادوں میں پناہ لینا شروع کر دیتا ہے جو اس کے لئے مسرت کا باعث ہوں۔

اردو افسانہ بہت سے رجحانات سے گزر کر ترقی کی راہ پر چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان میں سے ایک رجحان ہمیں افسانے میں نفسیاتی رجحان بھی نظر آتا ہے۔ ناسٹلجیا سے مراد اپنے ماضی کی یادوں یا گزرے ہوئے دنوں کا شدید احساس ہے۔ ہر فرد کی زندگی میں ناسٹلجیا کسی نہ کسی طور پر موجود ہوتا ہے۔ ایک ادیب اس کا اظہار اپنی تحریروں میں بخوبی کرتا ہے۔ ادب اور سماج کا تعلق بہت گہرا ہے۔ جب معاشرے میں کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو اس کے اثرات ادب پر بھی پڑتے ہیں کیونکہ ادیب بھی اسی معاشرے کا ایک فرد ہوتا ہے۔ وہ وہی کچھ اپنی تحریروں میں بیان کرتا ہے جن احساسات و جذبات کو محسوس کرتا ہے۔

ٹیکنالوجی خاص طور پر انٹرنیٹ اور برقی ترقی کی بدولت بظاہر انسان کی زندگی آرام دہ ہوگئی ہے لیکن ان ایجادات کی بدولت وہ بہت مصروف ہو گیا ہے۔ موبائل فون کی ایجاد نے تو انسانی رشتوں میں دوری اور بے حسی کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ دورجدید میں گلوبل ولیج بننے کے بعد دنیا میں دور بستے لوگوں سے رابطے کو جہاں آسانی سے ہمکنار کیا ہے تو اپنے آس پاس کے لوگوں سے رابطے اور بات چیت کے تناسب کو کافی حد تک کم کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے خارج سے اکتاہٹ کا شکار ہو کر اپنے باطن میں پناہ لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

یہ تمام عوامل اور محرکات ہی ایک فرد کو اپنے ماضی کی یادوں میں پناہ لینے میں معاونت فراہم کرتے ہیں۔ یوں تو ہر ادیب کسی نہ کسی طور پر اپنی تحریروں میں ماضی کی یادوں کا اور ماضی میں ہونے والے واقعات کو بیان کرتا ہے۔ میں نے تین ادیبوں جن میں انتظار حسین، محمد حمید شاہد اور محمد عاصم بٹ کے افسانوں کا مطالعہ ناسٹلجیا کے تناظر میں کیا ہے۔ ان تینوں مصنفین کے یہاں ناسٹلجیا کا اظہار ملتا ہے۔ انتظار حسین جو کے ہندوستان سے ہجرت کر کے قیام پاکستان کے وقت آئے تھے۔ اس لیے یہاں پر آکر وہ اس معاشرے اور تہذیب میں اجنبیت کا شکار ہوگئے تھے۔ اسی اجنبیت کے سبب ان کی تحریروں میں اپنی بستی کی یادوں، اپنے بچپن کے دنوں کا پرچار بہت شدت سے دکھائی دیتا ہے۔

انتظار حسین کا کردار ہمیں ناسٹلجیائی کردار کے طور پر دکھائی دیتا ہے اور ان کی تحریروں میں زیادہ تر کردار بھی ہمیں ناسٹلجیائی کردار کے طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

اسی طرح محمد حمید شاہد کا شمار دور حاضر کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں نائن الیون اور اس کے بعد کی بدلتی عالمی صورتحال اور اس کے نتیجے میں معاشرے پر رونما ہونے والے اثرات کو قلمبند کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں بھی ناسٹلجیا کا اظہار بہت شدت سے ملتا ہے۔ ان کے افسانوں کے اکثر کردار اپنے حال سے فرار کرتے ہوئے اور اپنے گزرے دنوں کی یادوں میں پناہ لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ دور حاضر کی معاشرت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں اور اپنے کرداروں کے ذریعے معاشرے کے تلخ حقائق اور مسائل کو بیان کرنے کا ہنر بھی خوب جانتے ہیں۔ جہاں ان کی کہانیوں کے کردار ہمیں اپنی

مٹی سے جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف وہ معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کے باعث اپنے حال سے خوش اور مطمئن نظر نہیں آتے۔ وہ ٹیکنالوجی کے آنے کے سبب پیدا ہونے والی رشتوں میں دوری، بے حسی اور لاتعلقی کے بارے میں بھی بیان کرتے ہیں کہ دور حاضر میں ایک فرد لوگوں کے ہجوم میں ہوتے ہوئے بھی کیسے خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ یہی تنہائی اپنے گزرے ہوئے دنوں کو سوچنے کی طرف راغب کر دیتی ہے۔

محمد عاصم بٹ کے افسانوں کے زیادہ تر کردار ہمیں خارج سے زیادہ اپنے باطن سے لڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ دور حاضر میں ہونے والی ایجادات اور اس کے نتیجے میں ہونے والی معاشرتی تبدیلیوں کی عکاسی کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ ان تبدیلیوں کے سبب جو سماجی اقدار میں تبدیلی ہوئی۔ ان کے علاوہ انسانی رشتوں میں دوری، تہذیبی توڑ پھوڑ کے جو عناصر پروان چڑھے اور ان کے بعد ایک فرد جو تنہائی اور بے یقینی کا شکار ہو کر اپنے حالات کی تلخی سے بیزار ہو گیا ہے تو وہ اپنے خارج سے زیادہ باطن سے جنگ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ انسانی نفسیات اسی ماحول میں سانس لیتی ہے جس میں وہ فرد اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ ان کے سب کردار ہمیں پر ہجوم جگہ پر رہتے ہوئے دور حاضر کے طرز کے مطابق زندگی گزارتے ہیں لیکن اس سب کے باوجود ان کے خارج کا شور مدھم جبکہ ان کے باطن، ان کے اندر کی آوازیں ان سب بیرون آوازوں پر حاوی ہو جاتی ہیں۔

ماضی انسان کے وجود کا ایک ایسا حصہ بن چکا ہے کہ جس سے فرار حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ ناسٹلجیا کا اظہار قیام پاکستان کے نتیجے میں ہجرت کرنے والے ادیبوں نے اپنی تحریروں میں کیا۔ لیکن دور حاضر میں ناسٹلجیا کے جنم لینے میں بہت سے عناصر ہمیں معاون نظر آتے ہیں۔ جس طرح برقی ترقی جیسے کمپیوٹر انٹرنیٹ موبائل فون وغیرہ کی ایجادات نے انسانی زندگی کے دھارے کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اگر اکیسویں صدی کا جائزہ لیا جائے تو ٹیکنالوجی میں ترقی ہونے کے سبب طرز زندگی بہت حد تک بدل گیا ہے۔ اس بدلاؤ اور تیز رفتاری کے باعث کچھ لوگ اس دوڑ میں دوڑنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ وہ پھر اپنے گزرے ہوئے یا پہلے کے دنوں کو ہی بہتر سمجھتے ہیں اور وہ ناسٹلجیا میں مبتلا ہو کر بیتے ہوئے دنوں کی خوشگوار یادوں میں جھانکنے لگتے ہیں۔

ہر ادیب اپنی تحریروں میں اپنے عہد کی بھرپور عکاسی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح ان منتخب کردہ ادیبوں انتظار حسین، محمد حمید شاہد اور عاصم بٹ نے اپنی تحریروں میں اپنے عہد کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے اس دور کے فرد کے مسائل کو بھی اجاگر کیا ہے۔ ایک فرد اپنے حال کی تلخی سے بیزار ہو کر کس طرح اپنے بیتے ہوئے دنوں میں جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یاداشت حافظے کا ایک ایسا حصہ ہے جہاں اچھے، برے سبھی قسم کے واقعات محفوظ ہوتے ہیں۔ یہ سب یادیں انسان کو کسی طور پر بھی تنہا نہیں چھوڑتی ہیں۔ یہ یادیں حال کی تلخی میں ہمیں خوشگوار یادوں کا احساس دلاتی ہیں۔

اکیسویں صدی کے افسانہ نگاروں کی بات کرتے ہوئے علی اکبر ناطق کے افسانوں میں ناسٹلجیا کا ذکر بھی ضروری ہے کیونکہ ناسٹلجیا ناطق کی کہانیوں (دیہی کہانیوں) کا مزاج ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "قائم دین" ۲۰۱۳ء میں اور دوسرا مجموعہ "شاہ محمد کا تانگہ" ۲۰۱۴ء میں چھپا۔ ان کے افسانوں پر ہمیں زمانوں کی گرد چڑھی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار موجودہ دور میں ہونے والی تہذیبی ٹوٹ پھوٹ کے باعث خود کو اس نئی تہذیب میں اجنبی محسوس کرتے ہیں۔ دیہاتوں میں جو تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں ان تبدیلیوں پر ان کے کرداروں کو اقدار کے نئے بحرانوں کا سامنا ہے جو ان کے آباء کے وہم گمان میں بھی نہ تھے۔ ان کے افسانوں میں قاری کو اڑھائی تین دہائیوں سے گزار کر زمانہ حال میں کھڑا کر دیا جاتا ہے ان کے افسانوں "نسلیں" سیاہ ٹھپا اور حاجی ابراہیم میں اگرچہ ہمیں عہد حاضر کے بیان کی وجہ سے کیفیات بدلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی تحریریں ناسٹلجیا کی عکاس دکھائی دیتی ہیں۔

اسی طرح طیب عزیز ناسک کا افسانوی مجموعہ "طاقتور شکاری کا المیہ" میں عصری مسائل کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے کردار ہمیں ماضی کے واقعات میں کھوئے ہوئے نظر آنے کے ساتھ ساتھ دکھ کے شکار بھی معلوم ہوتے ہیں۔ عصری صورت حال ان کے کرداروں کے ساتھ بھی جڑی ہے جو تنہائی کا شکار ہیں اور کسی حد تک ہمارے معاشرے سے کٹے ہوئے نظر آتے ہیں اسی طرح دورِ حاضر کے افسانہ نگاروں میں ابصار فاطمہ کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ ابصار فاطمہ کو اپنے زمانے کا نہ صرف مکمل ادراک ہے بلکہ اس پر ان کی گہری نظر بھی ہے۔ اسی طرح دور حاضر کی ایک اور افسانہ نگار فرحین خالد کے افسانوں میں ناسٹلجیائی کردار

دکھائی دیتے ہیں۔ "گونجتی سرگوشیوں" میں شامل ان کے افسانے ان کے اردگرد پھیلی زندگی کے سوشل، معاشی اور نفسیاتی، تلخ و شیریں واقعات کے عکاس ہیں۔

اسی طرح دورِ حاضر کے افسانہ نگاروں میں منزہ احتشام کا نام بھی قابل ذکر ہے ان کے افسانوی مجموعے "آئینہ گر" اور "کہانی کا آخری کنارہ" قابل ذکر ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار ہمارے آس پاس بسنے والے کردار ہیں۔ منزہ احتشام نے ان کردار کی نفسیات ان کی داخلی اور خارجی کی حیثیت کو بیان کیا ہے۔ ماضی و حال، قدیم و جدید یا روایت و جدت کے درمیاں معاشی و سماجی حصار کو سامنے رکھتے ہوئے اختصار سے کہانی کو نبھانا ایک مشکل کام ہے اور منزہ احتشام گوندل نے یہ کام خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ ناسٹلجیائی کردار ہمیں ہر ادین کی تحریروں میں دکھائی دیتے ہیں کیونکہ کوئی بھی ادیب ماضی کے واقعات کو اپنی تحریروں میں فراموش نہیں کرتا بلکہ کسی نہ کسی طور پر اپنے کرداروں کے ذریعے ماضی کی یادوں اور حالات و واقعات کا بیان ضرور کرتا ہے۔

ب۔ تحقیقی نتائج

گزشتہ ابواب میں ہونے والی بحث کے بعد درج ذیل تحقیقی نتائج سامنے آئے ہیں:

ا۔ دور حاضر میں برقی ترقی کی بدولت انسانی رشتوں کا انہدام اور تہذیبی توڑ پھوڑ کے سبب ناسٹلجیا پروان چڑھتا ہے۔

۲۔ ان تینوں ادیبوں کے افسانوں میں ناسٹلجیا کی مختلف اقسام کی عکاسی بہت وضاحت سے کی گئی ہے۔

۳۔ محمد حمید شاہد اور محمد عاصم بٹ کے افسانوں میں نائن الیون اور برقی ترقی کی بدولت ہونے والی سماجی تبدیلیاں یہ تمام عوامل ناسٹلجیا کا سبب بنتے ہیں۔

ج۔ سفارشات:

گزشتہ ابواب میں کی گئی بحث کے بعد حاصل ہونے والے نکات کی روشنی میں چند سفارشات پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ انتظار حسین کے افسانوں کا دیگر لکھاریوں کے افسانوں سے تقابل کروایا جاسکتا ہے۔

۲۔ محمد حمید شاہد کے افسانوں میں سیاسی اثرات کے حوالے سے تحقیقی کام کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ محمد حمید شاہد اور عاصم بٹ کے افسانوں کو ایم اے اور بی ایس کی سطح پر نصاب کا حصہ بنایا جائے۔

۴۔ محمد عاصم بٹ کے ناول پر ناسٹلجیا کے حوالے سے کام کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ عہد حاضر کے دوسری زبانوں کے افسانوں کے ساتھ محمد حمید شاہد اور عاصم بٹ کے افسانوں کا تقابل کیا جا سکتا ہے

کتابیات

بنیادی ماخذ

انتظار حسین، گلی کوچے، شاہ۔ پبلشرز، لاہور، ۱۹۵۶

انتظار حسین، خیمے سے دور، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۶

انتظار حسین، خالی پنجرہ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۳

انتظار حسین، آخری آدمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۳

انتظار حسین، شہرزاد کے نام، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء

محمد حمید شاہد، بند آنکھوں سے پرے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ محمد حمید شاہد، جنم جہنم، اے آر پرنٹرز، اسل

محمد حمید شاہد، دہشت میں محبت، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵

محمد عاصم بٹ، اشتہار آدمی، دوست پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸

محمد عاصم بٹ، دستک، دوست پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء

ثانوی ماخذ

انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ: تحقیق و تنقید، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۰ء

انور سدید، ڈاکٹر، اردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء

اقبال آفاقی، ڈاکٹر، اردو افسانہ فن ہنر اور متنی تجزیے، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء

انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر، ترقی پسند اردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار، ماڈرن پبلی کیشنز ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۲ء

اے۔بی۔ اشرف، ڈاکٹر، کچھ نئے اور پرانے افسانہ نگار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء

احمد سہیل، تنقیدی تحریریں، اردو افسانے کا نا ٹلج ٹ ا، قلم پبلی کیشنز، ممبئی ۲۰۰۴ء

روبینہ الماس، اردو افسانے میں جلاوطنی کا اظہار، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
سید وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء
سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء
سنبل نگار، ڈاکٹر، اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، دارالنور، لاہور، ۲۰۰۲ء
شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ) بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں (پورب اکاد
اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
شہزاد منظر، پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال، جامعہ کراچی، ۱۹۹۷ء
فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
نجیبہ عارف، نائن الیون اور پاکستانی اردو افسانہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء